دُنیائے آرزو

دُنیائے آرزو

مصنّفہ

میرزا ادیب بی اے (آنرز) ایڈیٹر "مصوّر" بمبئی

پبلشرز

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

بار اوّل ایک ہزار۔ ۱۹۴۱ء قیمت عہ

انتساب

تعلیمیافتہ بیکار نوجوانوں
کی
انقلابی رُوحوں کے نام!

مسیح الادیب

فہرستِ مضامین

تعارف!

از عبدالرحیم شبلی۔ بی کام ایڈیٹر خیام و عالمگیر لاہور

یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے کہ ہندوستان کے صرف دس فی صدی باشندے دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں۔ باقی نوّے فیصدی لوگ یا تو نانِ شبینہ کے لئے بھی محتاج ہیں، یا دوزخِ شکم پُر کرنے کے لئے ان کی نگاہیں مخیّر طبقہ کی طرف اُٹھتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں خلّاقِ اعظم نے سَو میں سے صرف دس آدمیوں کو اپنی رحمت و شفقت کا مستحق قرار دیا ہے اور باقی نوّے کو ابدی و ازلی لعنت و نکبت کا مورد گردانا ہے۔ ہندوستان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس وقت تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری ہے۔ اوّل تو تعلیم حاصل کرنا ہی سرمایہ داروں کا مشغلہ اور کھیل بن چکا ہے۔ لیکن اگر کوئی ادنےٰ طبقہ کا فرد، بیشمار مشکلات و مصائب کے دوزخ سے گزر کر، خوش قسمتی سے تعلیم یافتہ بن بھی جائے تو کالج یا سکول سے نکلتے ہی وُہ اپنے آپ کو ایک ایسے تلاطم خیز سمندر کی موجوں پر بہتا ہوا پاتا ہے جس کا کوسوں تک کوئی کنارہ ہی نظر نہیں آتا۔ پھر بھی زمانہ اس کے قوےٰ کی نشو و نما کا ہوتا ہے اور اسی دَوران میں وُہ کائنات کی حسین چیزوں سے محبت کرنا سیکھتا ہے۔ لیکن جب چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اسے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تو وُہ بھنّا جاتا ہے اور قدرتی طور پر اُس کے دل میں انقلاب و بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور وُہ چاہتا ہے کہ نظامِ کائنات کو تہ و بالا کر دے، سرمایہ داروں

کی گردن مروڑ کر رکھ دے، اپنے ملک کے جگمگاتے ہوئے "آسماں رتبہ" محلّات کو پاؤں کی ٹھوکر سے پیوندِ خاک کر دے اور سوسائٹی کے ظالمانہ قوانین کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اُن کی دھجّیاں بکھیر دے۔ لیکن اپنے آپ کو "مجبورِ محض" پاکر وہ کسمسا کر رہ جاتا ہے اور اکثر اوقات آغوشِ قبر کے سِوا، اسے کوئی گوشۂ عافیت نظر نہیں آتا۔

میرزا ادیب نے انہی تلخ حقائق کو آنسوؤں کی زبانی اپنی ڈائری میں بیان کیا ہے ادیبانہ شگفتگی اور لطافت کے دامن کو کسی جگہ بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور واقعات کو اس خوبی اور مہارتِ فن کے ساتھ افسانوی لباس پہنایا ہے۔ کہ وہ "شخصی" نہیں، بلکہ "ہمہ گیر" نظر آتے ہیں۔ لائق مصنف نے عہدِ حاضرہ کے بیکار تعلیم یافتہ طبقہ کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور نوجوانوں کے سینہ کی دھکتی ہوئی آگ کو صفحۂ قرطاس پر الفاظ کے قالب میں ڈھال کر رکھ دیا ہے۔ امید ہے آپکی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی آواز سرمایہ دارانہ نظام کے ایوان سے ٹکرائے بغیر نہ رہے گی اور "خوش حال متوسط طبقہ" کے دِل میں بھی وُہی کسک اور تڑپ پیدا کر سکے گی، جو بیکس و بےبس نوجوانوں کے لِئے فاضل ڈائری نویس کے قلب میں موجزن نظر آتی ہے۔

سلیم

۱۵-مئی ــــــــــــ

آج گھر کا ہر فرد مسرور و خنداں نظر آرہا ہے ــــــ!

ماں خوش ہے کہ اس کے لختِ جگر نے تعلیم کا آخری مرحلہ بھی بڑی کامیابی کے ساتھ طے کر لیا۔ بہنیں دلشاد ہیں کہ آج وہ بھائی کی کامیابی پر نئے نئے کپڑے اور گہنے پہن رہی ہیں، دادی اماں مسرور ہے کہ آج اس کے پوتے کو دو سال کی محنت کا میٹھا پھل مل گیا ہے۔ الغرض گھر کے ہر آدمی کا چہرہ مسرت کی روشنی سے چمک رہا ہے۔

کیا بی۔ اے کے امتحان میں پاس ہونا واقعی ایک قابلِ تعریف کارنامہ ہے؟

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو آج میرے پاس ہونے پر گھر کا ہر فرد، خاندان

کا ہر رُکن، اور محلّے کا ہر شخص کیوں اِس طرح خوش نظر آئے، کیوں اِس طرح خوش ہو کر مجھے مبارکباد دے! میری کامیابی صرف میری کامیابی ہی نہیں، تمام گھر کی، تمام خاندان کی، تمام محلّے کی کامیابی ہے۔

ننھّی شیریں اپنی ننھّی سی ڈھولک پر، اپنے ننھّے ننھّے ہاتھ مار رہی ہے۔ ثرّیا غسلخانے کو جا رہی ہے۔ آپا زہرا ایک بڑے سے ٹرنک کو کھول رہی ہیں اور ساتھ ساتھ بڑبڑاتی بھی جا رہی ہیں۔ کیونکہ والدہ نے انہیں نئی ساڑھی پہننے کی اجازت نہیں دی، اور وہ پرانی سفید ساڑھی پہننے پر تیار نہیں۔ رضیہ جلدی جلدی اپنی چُنری کا رفو دُور کر رہی ہے — اور ماں سوّیاں پکا رہی ہے۔ کیونکہ میں نتیجہ دیکھنے کے لئے صبح سویرے ہی بھُوکا پیاسا گھر سے نکل گیا تھا — اور اب یہ سوّیاں میرے لئے تیار کی جا رہی ہیں — !

اِس وقت ایک نشہ سا، ایک بے خودی سی میرے دِل و دِماغ پر چھائی ہوئی ہے، ہر چیز ہنستی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہر گوشہ حسین و رنگین دکھائی دے رہا ہے۔ اللہ! آج کا دِن کتنا حسین ہے — کتنا پیارا ہے!

تعلیم کا دِل و دماغ کو چُوسنے والا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب نہ ہر روز کی حاضری ہوگی، نہ دِن رات خشک کتابوں کا مطالعہ اور نہ ہر وقت امتحان کا ڈر، چودہ سال تک کتابوں کا کیڑا بنا رہا۔ اب نئی زندگی ہے، نئی دنیا ہے، نیا زمانہ ہے، مستقبل نئی نئی

دلچسپیوں، نئی نئی رنگینیوں اور نئی نئی دِلآ ویزیوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے

آج ماں کی آرزوؤں، بہنوں کے ارمانوں اور عزیزوں کی تمناؤں کے پورا ہونے کا وقت آ پہنچا ——— یہ لوگ کئی سال سے اس دِن کا انتظار کر رہے تھے اور کس بے چینی سے انتظار کر رہے تھے؟ اس کا اندازہ یا وُہ لگا سکتے ہیں یا مَیں:

چچی صاحبہ کو بھی میرے پاس ہونے کی اِطلاع مِل چکی ہوگی۔ وُہ کتنی خوش ہونگی اور وُہ ——— میری تمناؤں کا مرکز، میری دُنیا کی روشنی، میری پیاری نسیمہ کِس درجہ مسرور ہوگی۔ خدا کرے وُہ آج ہی یہاں آجائیں!

کل ثریّا کہہ رہی تھی، نسیمہ نے کہا تھا "اگر بھائی جان پاس ہو گئے، تو مَیں اُن کے گلے میں ہار ڈالوں گی ——— کیا واقعی میں اس قدر خوش قسمت ہوں کہ نسیمہ خود میرے گلے میں ہار ڈالے!

اے امی ———!

آج ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے دُنیا کی تمام مسرتیں حاصل ہوگئی ہیں ——

میری ساحرۂ جمیل، میری پیاری نسیمہ دوسرے کمرے میں کرسی پر بیٹھی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہی ہے ——— اور میرے دِل میں ایک لذیذ گدگدی ہو رہی ہے!

آج صبح میں اُنہی کے رنگین تصورات میں غرق تھا کہ اچانک قریب سے ایک

شیریں اور دلنواز آواز آئی :۔

" بھائی جان ! لیجئے مبارکباد دیں !"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میرے دل کا چاند میری نگاہوں کے سامنے ضوفشاں تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اسی وقت اس سے لپٹ جاؤں، اس کے پیارے پیارے گلاب آسا ہونٹوں اور اس کی کالی کالی غزالیں آنکھوں کو چوم لوں — کئی بار چوم لوں، مگر یہ آرزو ہی رہی۔ چچی جان بولیں " سلیم بیٹا ! سچی بات تو یہ ہے، تمہیں یہ کامیابی نسیمہ ہی کی دعاؤں کے طفیل حاصل ہوئی ہے ! بچاری ہر وقت دعا کرتی رہتی تھی میرے اللہ ! بھائی جان کو پاس کر دے !"

" کیوں نہ دعا کرتی، ایک تو میں نے ہار پرونے میں اتنی محنت کی تھی اور دوسرے مٹھائی کا معاملہ بھی تھا " نسیمہ نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

" تو گویا آپ نے لالچ کے زیر اثر دعائیں مانگی ہیں ؟" میں نے نسیمہ سے کہا۔

" یہی سمجھ لیجئے — ! معلوم ہوتا ہے مٹھائی کھلانا آپ پر بار گراں ثابت ہو رہا ہے !" نسیمہ بولی۔

" مٹھائی — یہ تو ایک معمولی بات ہے۔ کچھ اور مانگو "

" تو بھائی جان ! ایک ساڑھی لے دیجئے نا ! لیکن پسند میں خود کروں گی " وہ

مسکرا کر بولی !

" چل پگلی کہیں کی ، ابھی تو بچارہ پاس ہوا ہے - جب دو تین سو روپیہ ماہانہ تنخواہ لائے گا ، اس وقت ایک ساڑھی نہیں بیسیوں ساڑھیاں لے لینا " چچی بولیں

" ہوں ـــ اتنی دیر انتظار کروں ، وہ کیوں ؟ بیس ساڑھیاں لے کر کیا کرونگی مجھے تو ایک چاہیئے اور ابھی چاہیئے ـــ امّی ! بھلا آپ کیوں بولتی ہیں ، جیسے آپ کی جیب سے روپے نکل رہے ہیں " نسیمہ رُوٹھ کر بولی -

" مگر پگلی وہ ساڑھی لائے گا کہاں سے ؟ "

" بازار سے اور کہاں سے ؟ " نسیمہ جھٹ بول اٹھی ، اور پھر سر جھکا کر اپنی نیلی ساڑھی کے رنگین پھول کو دیکھنے لگی - آہ ! وہ اس وقت کس قدر حسین ، کتنی پیاری دکھائی دے رہی تھی -

آدھ گھنٹے کے بعد نسیمہ نے اپنے چرمی بکس میں سے ہار نکالا اور امّی کے ہاتھ میں دے دیا کہ وہ میرے گلے میں ڈال دیں - امّی بولیں :-

" بڑی محنت کی ہے تم نے نسیمہ ! دیکھو بیٹا ! یہ تمہارا ہار ہے ـــ خاموش کیوں کھڑے ہو - بہن کا شکریہ ادا کرو نا ! "

" میں شکریہ وکریہ ادا کرنے کو تیار نہیں - ہار ملا ہے آپ کو ، اس لئے آپ ہی

شکریہ ادا کریں!"

"لیکن ہار تمھارا ہے!"

"میرے گلے میں تو نہیں ہے — آپ کے ہاتھوں میں ہے"۔

امّی نے مسکرا کر نسیمہ سے کہا "لے بیٹی اپنی چیز اس کے گلے میں ڈال دے"۔

نسیمہ نے امّی کے ہاتھ سے ہار لیا اور شرماتی ہوئی، جھجکتی ہوئی آگے بڑھی —

اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا — معاً مسرت کی لہریں میرے دماغ سے ہو کر دل کی

گہرائیوں میں اُترنے لگیں — اب ہار میرے گلے میں تھا۔

ننھی شبیر اُچھل اُچھل کر تالیاں بجانے لگی — نسیمہ پیچھے ہٹی اور کرسی

پر بیٹھ گئی۔

۲۰۔ مئی ————— !

ویسے تو نسیمہ میں ہزاروں خوبیاں موجود ہیں۔ مگر اس کی سب سے بڑی

خوبی یہ ہے کہ وہ بے حد خوش مزاج ہے۔ میں نے آج تک اُس کو چیں بجبیں نہیں

دیکھا۔ ایک معصوم، دلنواز، اور رُوح افزا تبسم ہر وقت اس کے سُرخ سُرخ

ہونٹوں پر لہراتا رہتا ہے۔ ایک میٹھی جادو بھری، اور من موہنی شوخی ہر لمحہ اسکی

کالی کالی آنکھوں میں جھلکتی رہتی ہے — اُس کی دائیں آنکھ کے پاس ایک سیاہ

داغ ہے، جس نے اُس کے حسن و رعنائی میں خاص اضافہ کر دیا ہے، وہ جب کوئی معصوم شرارت کر کے مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھتی ہے تو یہ سیاہ داغ اتنا جاذبِ نظر، اتنا دلکش ہو جاتا ہے کہ جی چاہتا ہے اسے بے اختیار چوم لُوں ——— اور چُومتا ہی رہوں۔

آج صبح سویرے جب میں سیر سے واپس آیا اور اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا تبسمہ اُن کتابوں کو دیکھ رہی ہے جنہیں میں چند دن پیشتر لائبریری سے لایا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی سُرخی، اس کی آنکھوں میں ایک مبہم سا طنز، اور اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بھائی جان! یہ کتابیں آپ کب لائے تھے"؟ اُس نے کتابوں کے بنڈل کے گرد لپٹے ہوئے ریشمیں فیتے پر اپنے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"شاید ہفتہ کے دن لایا تھا"

"گویا آج ہی!"

"نہیں گزشتہ ہفتے کو!"

"امّی جان کہتی تھیں کہ تمھارے بھائی جان مطلعے کے اس قدر شائق ہیں، کہ اس فن میں اُن کا کوئی بھی ثانی نہیں۔ مجھے اس میں کچھ مبالغہ نظر آتا تھا، مگر آج معلوم ہو گیا، امی جان کا قول بالکل درست تھا"

یہ کہتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ طنز انگیز مسکراہٹ اسکی آنکھوں کے کونوں میں جمع ہو گئی۔

" مذاق کرتی ہو میرے ساتھ ۔۔۔ کتابیں بندھی رہیں کیونکہ آج کل میں بیحد مصروف ہوں ۔۔۔ یہ کتابیں تو بڑے اشتیاق سے لایا تھا"

" بھائی جان! معاف کیجئے، مگر میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ چور کی داڑھی میں تنکا شاید اسی موقعے پر استعمال ہوتا ہے۔"

" جی ہاں! آپ نے بالکل درست فرمایا اور لڑکیاں بھی اسی موقعے پر رپٹ جایا کرتی ہیں، دیکھ لو!"

مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر، اُس نے زور سے قہقہہ لگایا اور کمرے سے بھاگ گئی۔

ابھی ابھی امّی جان نے بتایا ہے کہ تمھاری چچی ایک ہفتہ اور یہاں رہینگی، ۔۔۔ اِس خبر سے مجھے اِتنی تکلیف پہنچی کہ میں امجد اور رفیق کے ساتھ تاش کھیلنے میں قطعاً دلچسپی نہ لے سکا۔ حالانکہ مجھے تاش کھیلنے کا بہت شوق ہے ۔۔۔ دو گھنٹے تک تاش کے پتّے میرے ہاتھوں سے فرش پہ گرتے رہے اور فرش سے ہاتھوں میں آتے رہے۔ یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہوتا رہا ۔۔۔ نسیمہ چلی جائے گی تو پھر کیا ہوگا؟ ۔۔۔ میرے

دل کی دُنیا تاریک ہو جائے گی — تاریک اَور بھیانک! — اللہ کہیں ایسا نہ ہو جائے — کہیں میری تمنائیں خاک میں نہ مل جائیں!

۲۲-مئی ——————!

کل شام میری زندگی کی حسین ترین — رنگین ترین شام تھی۔ میں اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا، اپنی محبوبۂ دلنواز کے کیف و مستی میں لپٹے ہوئے تصورات میں غرق تھا کہ زور سے دروازہ کھلا، اَور وُہ، میری شمعِ تمنّا، پانی کی ایک لہر کی مانند تیزی کے ساتھ اندر داخل ہو کر میری طرف دیکھے بغیر میز کے ایک سرے پر بیٹھ گئی۔ میں نے دوسری کرسی اپنی کرسی کے قریب بچھا دی اور نسیمہ کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کرسی کیطرف لیجانے لگا ——!

وُہ ذرا شرمائی، ذرا جھجکی، ذرا مُسکرائی۔ اَور پھر کرسی پر بیٹھ کر، دائیں ہاتھ کی انگلی، دیوار پر سُرخ چاک سے لکھے ہُوئے "ثریّا بانو" کے ٹیڑھے ترچھے حروف پر پھیرنے لگی۔ چند لمحے وُہ اِسی طرح اُنگلی پھیرتی رہی۔ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

فضا میں رنگ برنگے اَور مختلف شکل و صورت کے ہلکے پھلکے بادل لہرا رہے تھے۔ کچھ دُور، کھیت کی دُوسری طرف رُوئی کے ایک کارخانے سے دُھواں نکل نکل کر، پُرانے قلعے کی سنگین، مٹیالی دیواروں پر سائے بکھیرتا ہوُا فضا میں تحلیل ہو رہا تھا — قلعے کے وسطی بُرج پر ایک پرندہ اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ اتنے میں ایک

اَور پرندہ بھی اس کے قریب آ بیٹھا۔ دونوں نے اپنی چونچیں ملائیں اَور پھر ایک ساتھ اُڑتے ہوئے، دھوئیں کی نیلاہٹوں میں سے گزرتے ہوئے افق کے دُھندلکوں میں غائب ہو گئے۔

میں یہ منظر دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ نسیمہ کب کرسی سے اُٹھی، اَور کب دروازے پر جا کر کھڑی ہو گئی، مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر، وُہ دروازے سے ہٹی اَور قدم اُٹھانے لگی ـــــ میں جلدی سے اُٹھا اَور اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آیا۔

"جا رہی ہو نسیمہ!"

"تو اَور کیا کروں؟" نسیمہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ تو موسم کی دِلچسپیوں میں اتنے محو ہیں ـــــ اتنے محو ہیں ـــــ کہ اَب آپ کو کیا کہوں؟"

"کچھ کہہ بھی سکو، الفاظ ہی نہیں ملتے کہنے کو، خیر یہ بتاؤ، اِس وقت تم کیا محسوس کر رہی ہو؟"

"محسوس؟ ـــــ آپ ہی بتایئے مجھے کیا محسوس کرنا چاہیئے؟"

"خوب! تم اس قسم کی باتیں نہ کرو تو تمھیں شریر نسیمہ کون کہے؟"

"اَور آپ اِس قسم کا سوال نہ پوچھیں، تو آپ کو ستم ظریف کون سمجھے"! یہ کہکر

وہ ہنسی — اُس کے دِلنواز قہقہے کی آواز فضا میں گونج اُٹھی — اس طرح گونج اُٹھی! جس طرح اُسکی رنگین چوڑیوں کی جھنکار ایک لمحے کے لئے سمع نوازی کرجائے۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ اِس وقت سماں نہایت دِلکش ہے، فضا میں نشہ آلود نظارے رقص کر رہے ہیں، آسمان میں کالے اَور نیلے بادل لہرا رہے ہیں — پرندے چہچہا رہے ہیں، اِس لئے —"

"اس لِئے، اُٹھو پیارے بچو کہ میں آرہی ہوں!" نسیمہ نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

ہم دونوں ہنسنے لگے — اَور دیر تک ہنستے رہے۔ جب اس کی ہنسی ذرا تھمتی میں اس کے گدگدی کر دیتا۔ وُہ پھر زور زور سے ہنسنے لگتی۔

"آخر تم ہنستی کس بات پر ہو نسیمہ؟"

"تمھاری صورت دیکھ کر۔"

"میری صورت دیوارِ قہقہہ تو نہیں۔"

"یہی تو مَیں کہتی ہوں کہ آپ کی صورت دیوار قہقہہ نہیں۔ پھر بھی مجھے ہنسی آرہی ہے۔"

مَیں پھر اس کے گدگدی کرنے لگا — اُس کے بال بکھر گئے۔

"او چھوڑو بھی اب، کوئی دیکھے تو کیا کہے؟"

"پہلے ایک بات بتاؤ!"

"بال چھوڑو میرے بتاتی ہوں" اُس نے بال چھڑاتے ہوئے کہا۔

"بات تو منہ سے کرنی ہے، بالوں کا کیا کام؟"

"چھوڑو بھی، ورنہ ہاتھ پر کاٹ دُونگی، پھر چیخو گے — او چھوڑو بال — چھوڑو بھی — اُوئی دیکھو کوئی آرہا ہے — آئی امّی! مَیں یہاں ہُوں، چھوڑو امّی آگئیں۔"

"آجانے دو، کیا کہیں گی وُہ۔"

"اُف خدایا! میں رو پڑوں گی!"

"ہنسی کے بعد رونا لازمی اَمر ہے۔"

مَیں نے اس کی ایک لِٹ کو چُوم لیا — معاً اس کا رنگ سُرخ ہو گیا، اَور وُہ جلدی سے اُٹھ بیٹھی!

"لو بال چھوڑ دیئے، اب بیٹھی رہو!"

وُہ میز کے سِرے پر بیٹھ گئی اَور اپنی نگاہیں ایک کتاب پر گاڑ دیں۔

"نسیمہ!"

"ہوں!"

"بولتی کیوں نہیں ہو۔ سر میں درد ہونے لگا! مجھے بڑا افسوس ہے!" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دو، ورنہ میں چلی جاؤں گی۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"کیا ہماری زندگی اسی طرح قہقہوں ہی کی گود میں گزرتی رہے گی نسیمہ؟"

"مجھے کیا خبر۔۔۔؟" اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔

میں نے اس کے بالوں کو دوبارہ چوم لیا۔۔۔ اِس کے بعد ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔۔۔ دیر تک ایک دوسرے کو اپنی وفا اور خلوص کا یقین دلاتے رہے

آہ! وہ رات کتنی پیاری تھی۔

۲۶ مئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

آج شام کی تاریکی میں ایک نہایت غمناک واقعہ رُونما ہونے والا ہے۔۔۔ میرا دل افسردہ ہے، طبیعت مضمحل ہے اور رُوح اُداس۔۔۔ چچی صاحبہ کا سامان باندھا جا رہا ہے، بازار سے چیزیں خریدی جا رہی ہیں، چچی صاحبہ کے گھر والوں کو سلام بھجوائے جا رہے ہیں۔ آہ! یہ سب رخصت کی علامتیں ہیں۔۔۔ دو گھنٹوں،

صرف دو گھنٹوں کے بعد میری نسیمہ یہاں سے چلی جائے گی ـــ مجھے تڑپتا ہُوا چھوڑ کر چلی جائیگی۔ کاش! آج آفتاب کبھی بھی غروب نہ ہو ـــ کاش آج شام کی تاریکی کبھی بھی نہ آئے۔

میں مانتا ہُوں، میری نسیمہ وفا شعار ہے، محبت پرست ہے، تاہم دِل ہے کہ برابر ڈوبتا جا رہا ہے، اور رُوح ہے کہ ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس کر رہی ہے۔

ابھی ابھی وُہ تنہائی میں مجھ سے ملی ہے۔ اس کی غمگین آنکھوں، اس کے پژمردہ چہرے اَور اس کی دَرد میں ڈُوبی ہوئی آواز نے مجھے یقین دِلا دِیا ہے کہ جُدائی کا خیال اُس کے دِل پر بھی چرکے لگا رہا ہے اَور وُہ بھی میری طرح افسردہ و مایوس ہے ـــ وُہ کئی لمحے خاموش، تصویرِ غم بنی میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی :-

"ہم جا رہے ہیں!"

"مَیں جانتا ہُوں نسیمہ!"

"مگر تم اتنے مغموم ـــ!"

"کیونکہ میری جنت مجھ سے چھینی جا رہی ہے!"

"کاش تم مجھے سمجھ سکتے، اِس کے سوا مَیں اَور کیا کہہ سکتی ہوں؛"

"نسیمہ! میرا ایمان ہے کہ تم وفا سرشت ہو ـــــ تم کبھی بھی محبت کرنے والے دل کو دھوکا نہیں دو گی ـــــ تاہم ہم ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں گے"

"دُنیا میں ہر جگہ ایسا ہوتا رہتا ہے" یہ کہہ کر اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر یکایک اس کی آنسو بھری آنکھوں میں مسکراہٹ کی لہریں اس طرح دَوڑنے لگیں جس طرح جھیل کی گہرائیوں میں سورج کی شعاعیں لرز رہی ہوں۔ اس نے جیب سے سیاہ رومال نکالا اور آنسو خشک کرنے لگی۔

"نسیمہ! یہ رُومال مجھے دیدو گی؟"

اُس نے بغیر کچھ کہے رومال میرے ہاتھ میں دے دیا۔

"ایک چیز اور نسیمہ!"

"وُہ کیا؟"

"اَپنے بالوں کی ایک لٹ!"

"بالوں کی لٹ! اِسے لے کر کیا کرو گے ـــــ بھلا بالوں کی لٹ بھی کوئی چیز ہے!" وُہ ہنسنے لگی۔

"تمھیں اس سے کیا ـــ میرے لئے اِتنی ننھی سی قربانی!"

"لے لو میرا کیا حرج ہے!"

وُہ تیزی سے دُوسرے کمرے میں چلی گئی اَور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بالوں کی لٹ موجود تھی۔ اس نے لٹ کو بسنتی رنگ کے ریشمیں فیتے سے باندھ کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔

"اَب تو خوش ہو گئے نا؟"

"خوش بھی ہُوں اَور شکر گزار بھی!"

"اَور تم؟"

"مجھے اِس کا خیال ہے ــــ کہ یہ ننھی سی چیز تمھیں میری محبت کی یاد دلاتی رہے گی!"

یہ کہہ کر میں نے اپنی اُنگلی سے انگشتری اُتاری اَور اس کی اُنگلی میں پہنا دی اتنے میں باہر سے چچی کی آواز آئی ــــ نسیمہ دَوڑ کر باہر چلی گئی۔

۲۶۔مئی ــــــــ!

آخر وُہ واقعہ، جس کا تصوّر بھی میرے لئے رُوح گداز تھا، رُونما ہو گیا، میری نسیمہ چلی گئی ــــ میرا صبر و قرار تباہ کر کے، میری رَوشن دُنیا تاریک بنا کر چلی گئی۔

رخصت کے وقت جو منظر میں نے دیکھا، وُہ میں کبھی بھی نہیں بھُول سکتا۔ امّی جان نے مادرانہ شفقت سے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا اَور وُہ ایک طرف ہٹ کر

اپنے ہاتھ سے ماتھا پونچھتی ہوئی کچھ محجوب سی نگاہوں ~~سے مجھے دیکھنے~~ لگی۔

"دیکھنا نسیمہ! مجھے بھول نہ جانا۔" مَیں نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

وُہ خاموش رہی ۔۔۔ خاموشی کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی ۔۔۔ اس کے چہرے پر حسرت جھلک رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وُہ کچھ کہنے کے لئے بے تاب ہے۔ مگر مجبوراً بول نہیں سکتی۔

چچی صاحبہ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "خدا تمھارا اقبال زیادہ کرے اور جلد ہی تمھیں دو ڈھائی سو کی نوکری مل جائے۔"

"اس پر امّی جان بولیں۔ "خیر سے پڑھائی تو ختم ہو گئی، اب نوکری ہی کرنی ہے نا!"

"دیکھ لینا بہن! ہمارا سلیم کم از کم ڈھائی سو روپے پر ملازم ہو گا۔" چچی جان نے پیار سے میری ٹھوڑی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"خدا تمھاری زبان مبارک کرے، جیسے ہی پہلی تنخواہ ملی حضرت پیر دستگیر کی نیاز دیں گے۔" والدہ بولیں۔

"اگر پہلی تنخواہ پیر صاحب کی نذر ہونے کی بجائے کسی جیب تراش کی نذر ہو

گئی تو —!"

اس پر تمام ہنس پڑے — تسنیمہ بھی مسکرانے لگی۔

"بیٹا! نوکری کے لئے پوری پوری کوشش کرنا، آج کل زمانہ بہت بُرا ہے۔ عرضیاں بھیجنے میں سُستی نہ ہو۔" چچی جان نے کہا اور امّی جان سے گلے ملنے لگیں۔

میں انہیں گاڑی میں چھوڑ آیا ہوں — آہ میری تسنیمہ کی وُہ آخری حسرت انگیز نگاہیں — دل پریشان ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے یا میرے دل کا کچھ حصّہ چھین لیا گیا ہے۔

۶۔جُون —————!

رات سینما سے واپس آیا تو دیکھا، امّی پھوپھی خیراں (ہماری بوڑھی ہمسائی) سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہیں۔ میں چپکے سے اُن کے پاس پہنچا اور ان کی باتیں سننے لگا

پھوپھی خیراں نے پوچھا۔ "تو اس کی ماں راضی ہو گئی؟"

"کیوں نہیں، میرا لال بی اے ہے، خاندان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے اور پھر گُن دیکھو!"

"اب تمھارے منہ پر کیا کہوں بہن! تمھارے لال کی تو سب لوگ تعریفیں کرتے ہیں، کل ہی رضیہ کے ابا جی کہہ رہے تھے، حاجی حسن دین کا بیٹا تو اتنا شریف ہے کہ

تعریف نہیں ہو سکتی، نہ کبھی کسی سے لڑتا ہے نہ جھگڑتا ہے۔"

"یہ سب خدا کی مہربانی ہے۔"

"پر تم نے تو بات کی ہو گی!"

"میں کیوں بات کرتی بھلا، وُہ خود ہی کہنے لگی۔ بہن! میری نسیمہ تمہاری بیٹی ہے۔"

"جی ہاں، نیکوں کی تمام دُنیا گاہک ہے۔"

"میں نے بھی ہامی بھر لی، اور میرا سلیم بھی اس رشتے کو پسند کرتا ہے۔ دیکھتی ہو کل نسیمہ کی کتنی تعریف کر رہا تھا۔"

"ہوں، ہوں، ہوں"— پھوپھی خیراں نے سر ہلا کر، اور اپنی لمبی ناک پہ اُنگلی رکھ کہ کہا۔

امی کسی گہری سوچ میں پڑ گئیں۔

"بہت اچھی جوڑی ہے، خدا سلامت رکھے" پھوپھی بولیں۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور غالب کی غزل

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں، بات بنائے نہ بنے

گانے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ تمام دیوان پڑھ ڈالوں، اتنے میں امی کی آواز آئی

"بیٹا سلیم! گئے تھے شام کو؟"

"کہاں امی؟"

"خالصاحب کے ہاں اور کہاں!"

"مَیں سینما سے واپس آ رہا ہوں۔"

امی کمرے میں آ گئیں،

"جاؤ نا بیٹا وہاں، صبح اُن کی ماما بھٹیارن سے روٹیاں پکوانے آئی، تو ادھر بھی آ نکلی۔ باتوں باتوں میں کہنے لگی۔ آج کل "صاب" کے پاس کئی لوگ نوکری کے لئے آتے ہیں!"

"تو پھر مَیں کیا کروں، آتے ہوں گے!"

امّی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"پگلا کہیں کا ۔۔۔ مَیں کہتی ہوں، جلدی وہاں پہنچو ۔۔۔ اور ملازم ہو جاؤ۔ بی۔اے کئے ایک مہینہ ہو گیا۔"

مَیں حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا۔

"ایک مہینہ نہ سہی، بیس دن تو گزر ہی گئے نا! یہ آوارہ گردی اچھی نہیں بیٹا! لوگ اسے بُرا سمجھتے ہیں۔ صبح سویرے وہاں پہنچو۔"

" تو خانصاحب نوکریاں تقسیم کرتے پھرتے ہیں ؟"

" تم کیا جانو، سرکار میں ان کا کتنا مرتبہ ہے، جس کام کی ہامی بھر لیتے ہیں، اُسے پورا کر کے چھوڑتے ہیں۔ فیروز کو کتنی بڑی نوکری دلا دی تھی، یاد ہے نا؟ — اب خیر سے اس کی شادی بھی ہو رہی ہے ایک بڑے امیر گھرانے میں۔ اور تمھاری شادی بھی تو کرنی ہے۔ نسیمہ کی ماں کہتی تھی، سلیم سے کہنا کوئی بڑی اچھی نوکری تلاش کرے اب بھولے کیوں بنتے ہو تمھارے سامنے ہی تو اس نے کہا تھا۔"

امی مسکرانے لگیں۔

" اچھا بابا، کل صبح چار بجے ہی خانصاحب کی ڈیوڑھی پر حاضر ہو جاؤں گا۔"

" چار بجے کیوں، دن چڑھے جانا — یہی کوئی آٹھ نو بجے، چار بجے تو وُہ سو رہے ہوں گے۔"

یہ کہکر امی چلی گئیں۔

۷۔ جُون ————— !

صبح میں چارپائی پر لیٹے "تشیلے" کی جادو اثر نظم "ایک ہندوستانی گیت" مزے لے لے کر پڑھ رہا تھا کہ امّی کمرے میں آکر بولیں :-

" بیٹا! اب اُٹھو نا۔ خانصاحب کے پاس جانا ہے، یاد نہیں رہا تمہیں، چھوڑو

اِن نامُراد کنایوں کو، چائے تیار ہو گئی ہے، کلچہ لے آؤ بازار سے"!

اس وقت نظم نے دل و دماغ پر ایک نشہ سا چھڑک دیا تھا اور روح میں ایک عجیب لذت انگیز ورد لہریں لے رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ غروب آفتاب تک یونہی لیٹا رہوں ـــ یونہی اپنی دل پسند نظمیں پڑھتا رہوں۔ مگر امی کے ارشاد کی تعمیل کرنا بھی فرض تھا، ناچار اُٹھا، غسل کیا، کپڑے بدلے اَور چائے پی کر خانصاحب کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔

سُورج مشرقی آسمان پر جلوہ نما ہو کر، کائنات کے گوشے گوشے میں شعاعوں کا جال بکھیر رہا تھا، دُنیا بیدار ہو کر زندگی کا ثبوت دے رہی تھی ـــ دُکانوں کے مالک اپنے پیدا کرنے والے کو مختلف ناموں سے یاد کر کے اَور دُکانوں کے چبوتروں پر سوئے ہوئے فقیروں کو پاؤں کی ٹھوکروں سے جگا جگا کر، بھاری بھرکم تالے کھولنے میں مصروف تھے۔ چبوتروں کے نیچے خاکروب نالیوں میں سے ٹوٹی پھوٹی اینٹیں، پتھر، برتنوں کے ٹکڑے باہر نکال نکال کر، گندے اَور ٹھہرے ہوئے پانی میں روانی پیدا کر رہے تھے۔ کہیں کہیں دُودھ اَور اخبار بیچنے والے زور زور سے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے۔

میں خانصاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ خانصاحب کی بیٹھک کا دروازہ بند تھا۔

مَیں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ دو منٹ کے بعد دروازہ کھُلا، خانصاحب کا قدیمی خادم حسن باہر نکلا اور اشارے سے کسی کو بُلانے لگا۔ چھان بُورا اور پُرانی بوتلیں خریدنے والا غریب آدمی کندھے پر ایک بوری اُٹھائے ہوئے آیا اور حسن کو ایک خاص انداز سے دیکھنے لگا۔ حسن اندر چلا گیا، اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کئی بوتلیں تھیں، ایک بوتل کے لیبل نے راز فاش کر دیا ـــ میرے دل پر ایک خاص دھچکا سا لگا۔ کیا یہ حقیقت ہے خواب تو نہیں ـــ میں دل میں سوچنے لگا۔

حسن نے جلدی جلدی بوتلیں بوری میں ڈال دیں۔ بوتلیں خریدنے والے نے چند سکّے ایک میلی کچیلی تھیلی میں سے نکال کر حسن کے ہاتھ میں رکھ دیئے ـــ حسن اندر جانے ہی والا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر کہا :۔

" خانصاحب ـــ ؟"

" وُہ ابھی سو رہے ہیں"۔ اس نے میرا فقرہ کاٹتے ہوئے کہا۔

" کب بیدار ہونگے ؟"

" بیدار ہو کر اُنھوں نے غسل بھی کرنا ہے۔ کم از کم ایک گھنٹہ لگے گا غسل کرنے میں ـــ ذرا ٹھہر کر آیئے یا اندر بیٹھ کر انتظار کیجئے !"

" مَیں ذرا ٹھہر کر آؤں گا!"

وہاں سے ہٹ کر میں ایک طرف چلنے لگا، اور سوچنے لگا کہ "دنیا خانصاحب کو بہت بڑا عالم، فاضل اور دیندار سمجھتی ہے اور اس میں شک نہیں، کہ وہ ہیں بھی ان اوصاف کے مالک ـــ صوم وصلوٰۃ کے سختی کے ساتھ پابند ہیں ـ خیرات دیتے ہیں اور گزشتہ سال حج بھی کر آئے ہیں ـــ پھر یہ بوتلیں ـــ ؟ مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ خانصاحب نے بوتلیں منگوا کر پی بھی ہوں گی ؟ خانصاحب کے بڑے بڑے افسر دوست ہیں ـ ممکن ہے، ممکن کیا یقینی طور پر یہ بوتلیں خانصاحب نے انہی افسر دوستوں کے لئے منگوائی ہوں گی ـــ آخر خانصاحب کو شراب سے کیا تعلق ؟ اور یہ بھی ممکن ہے خانصاحب نے یہ بوتلیں کسی دعوت کے لئے منگوائی ہوں ـ کیونکہ آج کل کوئی دعوت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس میں پینے پلانے کا انتظام نہ ہو ـــ یہی بات ہے !"

بازار کے دو تین چکر لگانے کے بعد میں پھر خانصاحب کی کوٹھی پر پہنچ گیا ـ اب کے بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا ـ میں کمرے میں داخل ہو گیا ـ کمرے میں صرف ایک شخص نظر آ رہا تھا، جو غالباً خانصاحب کا ایک برخاست شدہ نوکر تھا ـ میں کرسی پر بیٹھ گیا ـ بیٹھک کے پہلو میں دالان تھا، جہاں خانصاحب کا چھوٹا لڑکا رفیع الدین اپنے ایک ہمجولی کے ساتھ کھیل رہا تھا ـ کھیل بھی کیا عجیب شے ہے، اور بچے بھی کتنے نیک سرشت ہوتے

ہیں۔ امیری اور غریبی کا سوال جوانوں اور بوڑھوں میں ہوتا ہے، بچوں میں قطعاً نہیں۔ رفیع لاکھ پتی باپ کا بیٹا ہے اور اس کا دوست شبّو ایک غریب پھل بیچنے والے کا لڑکا مگر دونوں میں ذرہ بھر امتیاز نہیں، دونوں ایک دوسرے کو "او ئے" کہہ کر پکار رہے ہیں — دونوں میں انتہائی بے تکلفی ہے — اتنے میں شبّو کا باپ بھی آ گیا۔

پندرہ منٹ کے بعد خانصاحب تشریف لے آئے، اور مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے "عرضی" پیش کی — مسکرا کر بولے "بھئی چپکے چپکے بی۔اے کر لیا اور مٹھائی تک بھی نہیں کھلائی — خیر مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم اپنے خاندان میں پہلے شخص ہو جس نے بی۔اے کیا ہے، باقی تو تمام جاہل ہیں — ہاں ٹائپ وغیرہ جانتے ہو نا؟"

"زیادہ مہارت نہیں!"

"تو بھائی مہارت پیدا کرو نا — کام وغیرہ ہو جائے گا۔"

"بڑی مہربانی — نوازش!"

"کوئی بات نہیں — ذرا ٹھہرو! ایک عرضی بھی لکھ دو — ابھی پتہ بتاتا ہوں۔"

پھر وہ شبّو کے باپ کی طرف مخاطب ہوئے۔

"کیوں میاں دَولے! تم کیسے آ نکلے؟"

"جی خانصاحب جی، مَیں نے عرض کی جناب، اِس کے ماشٹر پھیس ماف نہیں کرتے — جناب!"

"کِس کے ماسٹر — تمھارے لڑکے کے؟"

"جی جناب — او شبّو! اِدھر آؤ — یہ ہے جناب میرا لڑکا۔ تیسری جماعت میں پڑھتا ہے۔"

دونوں دوست بھاگ کر آ گئے۔

خانصاحب نے قلم اٹھایا اَور کچھ لِکھنے لگے — دَولے کے ہاتھ خود بخود مِل گئے — شاید اس کو خود بھی خبر نہیں تھی کہ وُہ ہاتھ باندھے کھڑا ہے — خانصاحب نے چند سطریں لِکھ کر کاغذ لفافے میں ڈال کر اَور اس پر پتہ لِکھ کر لفافہ دَولے کے حوالے کر دیا۔

"ہیڈ ماسٹر کو دے دینا!"

"مہربانی حضور کی!"

یہ کہکر میاں دَولے نے دوسری کرسی سے ایک ٹوکری اٹھا کر خانصاحب کی میز پر رکھ دی۔

"یہ کیا — یہ کیا بھئی؟"

"کچھ پھل ہیں حضور، میاں رفیع کے لئے لایا تھا!"

"بڑی تکلیف کی — خواہ مخواہ یہ بوجھ اُٹھایا — حسن! لے جاؤ ٹوکری کو اندر — دولے میاں! لڑکے کی فیس وغیرہ معاف ہو جائے گی، کوئی اور کام؟"

"بس مہربانی — حضور کی!" دولے نے کہا اور دروازے کی طرف اس تکلّف سے چلنے لگا کہ خانصاحب کی طرف پشت نہ ہونے پائے۔

دولے کے چلے جانے پر دونوں دوست پھر کھیلنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ اب شبّو شرما شرما کر، جھجک جھجک کر کھیل رہا ہے — نہ صرف یہ بلکہ وُہ اپنے دوست کو "رپھو" کہنے کی بجائے رفیع کہہ رہا ہے۔ اس کی آواز میں ایک ملائمت سی پیدا ہو گئی ہے، اور اس کے مقابلے میں رفیع اپنے ہمجولی کو اس طرح پکار رہا ہے گویا غریب لڑکا اس کا دوست نہیں خادم ہے — اتنی جلدی یہ تغیر — اتنے معمولی سے واقعے پر یہ انقلاب!

امیری اور غریبی کا سوال بچوں میں بھی پیدا کر دیا جاتا ہے — یہیں سے امارت کی راہ الگ کر دی جاتی ہے، اور غربت کا راستہ الگ! — غریب بچے کے باپ کا امیر بچے کے باپ کے سامنے بار بار جھکنا، بار بار عاجزی کا اظہار کرنا اور

بار بار خوشامد کرنا بچّوں کے معصوم ذہنوں میں ایک ایسا زہر بکھیر دیتا ہے، جو انہیں کبھی بھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آنے دیتا —— دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں —— وہ آپس میں بولتے ہیں، کھیلتے ہیں، اکٹھے سکول جاتے ہیں سکول کا کام کرتے ہیں۔ مگر ایک کے دماغ پر امارت کا نشہ چھایا ہوتا ہے، اور دوسرے کے دماغ پر غربت کا تلخ احساس —— دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں۔

سوسائٹی کا نظام ہی ایسا ہے —— ایک انسان دوسرے انسان سے نہیں ملتا —— بلکہ ایک امیر جب ایک غریب سے ملتا ہے تو دونوں اس انداز سے ملتے ہیں کہ امیر سمجھتا ہے، بحیثیت امیر آدمی ہونے کے اُسے غریب پر ہر قسم کی فوقیت حاصل ہے اور غریب سمجھتا ہے، ایک غریب آدمی ہونے کی حیثیت سے وہ امیر آدمی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں —— جب تک یہ تصوّر قائم ہے انسانی مساوات کا تصوّر، ایک خوابِ پریشان کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

گھر پہنچ کر میں نے خانصاحب کی بات سُنا دی، امّی بہت خوش ہوئیں، اور کہنے لگیں۔ "دیکھا نا، مَیں نہ کہتی تھی، خانصاحب بہت بڑے اور بہت اچھے آدمی ہیں۔ جلدی جلدی "ٹیپ" سیکھ لو"

۹۔ جُون ــــــــــــــــ!

آج بارہ بجے کی ڈاک سے میری پیاری نسیمہ کا پیارا۔۔ خوشبو میں لپٹا ہُوا دلنواز خط ملا۔ نسیمہ کی جاں نواز تحریر کو کئی بار پڑھ چکا ہوں، مگر دل کو تسلی نہیں ہوئی۔ خط کی عبارت حفظ ہو چکی ہے۔ نسیمہ نے لکھا ہے:۔

" ؎ میری قسمت سے کھیلنے والے۔ مجھے قسمت سے بیخبر کر دے

جناب سلیم صاحب!

آپ کو خط لکھتی ہوئی ڈرتی ہوں کیونکہ آپ ٹھہرے بڑے نکتہ چیں لفظ لفظ میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دینگے۔ مگر میں کیا کروں، اظہارِ خیال مقصود ہے، ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہی ہیں سہی:

یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا ہے مگر طبیعت کو ذرہ بھر سکون نہیں، نہ معلوم آپ نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے ؎

تم نہیں بھُولتے جدھر جاؤں

ہائے میں کیا کروں، کِدھر جاؤں

مفصّل خط پھر لکھوں گی، اس خط کو ایک قسم کا وعدہ سمجھ لیجئے۔۔ امّی جان آپ کی بہت تعریف کرتی رہتی ہیں اور آپ کی تعریف سُن سُن کر میرا دل اتنا خوش ہوتا

ہے کہ کیا کہوں — اُمید ہے آپ ملازمت کی تلاش میں مصروف ہونگے — کل امّی نے بھائی جان سے کہا تھا کہ سلیم کو لکھّو کوئی نہایت شاندار نوکری تلاش کرے — سمجھے میری امّی آپ کے بارے میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہی ہیں ؟ امید ہے، ہماری آرزو بہت جلد پوری ہو جائے گی۔

مَیں تو ہر حال میں عقیدت مند ہوں، دُوسروں کو بھی اعتراض نہیں ذرا آپ کو نوکری ملنے کی دیر ہے۔ جواب بہت جلد دیں، میں منتظر ہوں۔

آپکی .....

نسیمہ

۱۰ جُون —————!

"ہماری آرزو بہت جلد پوری ہو جائے گی" — کتنا پیارا ہے یہ فقرہ — کتنا پیارا — کس قدر پیارا —

اماں جان بھی عجیب ہیں، بہتیرا سمجھایا کہ ڈیڑھ دو ماہ تک خانصاحب کے ذریعے کوئی معقول ملازمت مل جائے گی، مگر وُہ میری کب سنتی ہیں، جھٹ تانگہ کرایا، اور مجھے ساتھ لے کر اچھّرہ میں میاں شفیع احمد کے ہاں پہنچ گئیں (میاں شفیع احمد ہمارے دُور کے رشتہ دار ہیں) اور اس وقت تک چین نہ لیا جب تک میاں

صاحب سے انتہائی منّت سماجت کر کے نوکری کا وعدہ نہیں لے لیا۔ مجھے کتنی شرم آتی ہے اِن باتوں سے، نوکری نہ ہوئی بادشاہت ہوگئی ــ تعلیم سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اب نوکری نہیں کرونگا تو اور کیا کرونگا۔ مگر نوکری کے لئے اتنی بیتابی بھی تو جائز نہیں، امیروں کے سامنے گڑگڑانا ایک معیوب امر ہے۔

میں بھی راہ میں امّی سے نہیں بولا گھر آکر اُنہوں نے میری پیشانی چوم کر کہا "خفا کیوں ہوتے ہو میرے لال! مَیں چاہتی ہوں کہ تمھیں بہت جلد بڑی تنخواہ والی نوکری مل جائے۔ پھر تیرے سر پر پھولوں کا سہرا بندھے۔ تو موٹر میں بیٹھے اور بڑی ہی خوبصورت دُلہن بیاہ لائے ــــ میری بہو ماشاءاللہ حُور ہے حُور، بڑی خوبصورت، گھر کے دھندوں میں ماہر ــ اور پھر ایسی حلیم ــــ ایسی حلیم"۔

امی جان نے ابھی پورا فقرہ بھی نہیں کہا تھا کہ ثریا بول اُٹھی ــــ مَیں دس روپے لوں گی بھائی جان سے، اور ایک مخمل کا سُوٹ ــ نہیں دو ــــ یہی تو پہن کر بھائی جان کے سُسرال جاؤنگی"۔

"ارے دونوں سُوٹ یکدم پہن کر جاؤ گی ؟" پھوپھی خیراں کھڑکی سے جھانک کر بولی۔

"تو کیا بھائی جان مجھے بھول ہی گئے ہیں ــ مَیں ــــ مَیں تو امّی آپ نے

کہا تھا نا بھائی جان کی شادی پر ـــ"

" مجھے یاد ہے بہن !" امی رضیہ کا فقرہ کاٹ کر بولی۔

مَیں نے دیکھا کہ دالان سے آپا زہرا بھی مسکراتی ہوئی آ رہی ہیں، کوئی وعدہ لینے یا کسی وعدے کی یاد دلانے ـــ مَیں دَوڑ کر بیٹھک میں آ گیا۔

ماں کو بیٹے کی شادی کی کتنی آرزو ہوتی ہے، اَور بہنوں کو بھائی کے چہرے پر سہرا دیکھنے کا کتنا ارمان !

میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی ـــ ایک بڑی لذیذ، بڑی میٹھی، بڑی پیاری سی گدگدی ـــ مَیں نے جھٹ الماری کھولی اَور اپنی پیاری نسیمہ ـــ اپنی دلنواز محبوبہ کے ریشمیں بالوں کی لٹ نکالی اَور اسے لبوں سے لگا لیا، آنکھوں سے لگا لیا ـــ کتنے پیارے ہیں یہ کالے کالے، لمبے لمبے بال ـــ اَور کتنی پیاری ہے اِن پیارے پیارے بالوں والی ـــ محسوس ہوتا تھا ستاروں کی دنیا میں اُڑتا چلا جا رہا ہوں ـــ اَور میرے اِرد گرد نشے برس رہے ہیں۔

آج رات اپنی محبوبہ کو خط لکھوں گا ـــ بڑا لمبا چوڑا خط ـــ اس خط میں خوب خوب شکوے کرونگا ـــ مگر اُس نے کیا کیا ہے ؟ کچھ نہیں ـــ پھر بھی شکوے کرونگا۔ محبوبہ سے شکوے کرنا، ایک نہایت حسین شغل ہے ـــ واقعی ایک نہایت حسین

شغل ـــ کہتی تھی رُومال بھیج دوں گی، مگر ابھی تک رومال بھیجا ہی نہیں، شاید یاد نہیں رہا، یا لفافے میں رومال ڈالنے سے ڈرتی ہے۔

کل بڑی چالاکی کی میں نے ـــ امّی سے کہدیا، جالندھر میں میرے ایک قدر دان پروفیسر موجود ہیں، انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جب بی، اے کا نتیجہ نکلے، سیدھے میرے پاس چلے آنا، ایک اچھی جگہ پر ماسٹر رکھوا دُونگا۔

امی بولیں۔" تو پھر جاتے کیوں نہیں ؟"

" کیا کرنے جاؤں امیّ !"

" خود ہی تو کہہ رہے ہو "

" تو رات کہاں رہونگا ؟"

" چچی کے ہاں اَور کہاں ـــ اَور جالندھر میں ہمارا ہے کون ؟"

" بہت اچھا امی ! کل ہی چلا جاؤں گا۔"

کل صبح جالندھر جاؤں گا ـــ کم از کم ایک رات تو اپنی محبوبہ کے ہاں رہونگا چچی نے کچھ پوچھا تو دیکھا جائیگا۔

۱۵ جُون ــــــــــــ !

مسلسل چار دِن اَور چار راتیں چچی کے ہاں گزارنے کے بعد آج صبح

لاہور آ گیا ہوں۔

اس عرصے میں مَیں اَور میری نسیمہ کئی کئی گھنٹے باتیں کرتے رہے ۔ محبت کا مقدس رِشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ وَیسے تو تمام ملاقاتیں نشے کی لہریں بن کر میری روح پر چھا گئی ہیں مگر وُہ ملاقات جس کا میں ذِکر کرنے والا ہوں، تادمِ واپسیں بھی مجھے نہیں بھُول سکتی۔

شام کا وقت تھا۔ نسیمہ اَور مَیں، دونوں کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ اس نے اپنے سامنے ایک کتاب کھول رکھی تھی، گویا مجھ سے پڑھ رہی ہے۔ اَور میں اس انداز سے بیٹھا تھا جیسے اُسے پڑھا رہا ہُوں۔

فضا میں، کئی رنگ کے چھوٹے چھوٹے ابر پارے، ڈوبتے ہوئے سُورج کی شعاعوں سے کھیلتے، اُڑتے چلے جا رہے تھے۔ میری محبوبہ کا چہرہ زرد زرد کرنوں میں اَور دِلآویز ہو گیا تھا، اس کی آنکھوں میں ایک پُر اسرار مقناطیسی قوت پیدا ہو گئی تھی اَور اس کے سُرخ سُرخ گالوں پر بکھرے ہوئے نکہت آلُود سیاہ ریشمیں بال ہوا کے جھونکوں سے لہرا لہرا کر، ایک بڑا پیارا انظارہ پیش کر رہے تھے ـــــ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنی محبوبہ کے پہلو میں ایک چاندی کی کشتی میں بیٹھا ہوں ـــــ ہماری کشتی بہے جا رہی ہے ـــــ ایک میٹھے راگ کی طرح بہے جا رہی ہے۔

آہ وُہ لمحات! ـــــ فردوسی مسرتوں میں ڈوبے ہوئے رنگین و نشہ آلود لمحات!

مَیں نے اس سے پوچھا ـــ "میری نسیمہ! تم نے ذرے کو آفتاب تو بنا دیا، اب کہیں اِس آفتاب کو مایوسی کے تاریک اَور گہرے غار میں نہ دھکیل دینا ـــ تمہاری محبت میری رگ رگ میں اِس طرح سرایت کر گئی ہے کہ تم اگر مجھ سے چھن گئیں تو اس صدمے سے مَیں زندہ نہیں رہ سکونگا۔"

اس نے میری طرف دیکھا اَور اس کی لمبی لمبی پلکوں پر موتی سے چمکنے لگے

"منہ سے کچھ نہیں کہو گی نسیمہ!"

"مَیں کیا کہوں ـــ کہنے کے لِئے میرے پاس الفاظ کہاں ہیں؟"

"پھر بھی؟"

"پھر بھی! ـــــ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تو مَیں یہ یقین کر لوں کہ میری نسیمہ، ہمیشہ میری نسیمہ رہیگی؟"

"آپ کو اس میں شک ہے؟" ـــــ وُہ غمگین سی ہو گئی۔

"مجھے تو قطعاً شک نہیں مگر سُنا ہے نسیمہ! عورتیں بڑی متلون مزاج ہوتی ہیں۔ ان کو اپنی رائے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں اپنے ایک ایسے دوست کا قِصّہ

جانتا ہُوں، جس کی محبوبہ اس پر اپنی جان چھڑکتی تھی اور کہتی تھی کہ اگر مجھے اس بات کا یقین ہو جائے کہ مرنے کے بعد میرا سر تمھارے زانو پہ ہو گا، تو میں اس حسین موت کو زندگی پر ترجیح دُونگی ــــ مگر اس کمزور دِل عورت نے آخر بے وفائی کی کیونکہ اس کا محبوب دولتمند نہیں تھا، بالکل غریب اور بالکل سیدھا سادہ انسان تھا۔"

"مجھے دُوسروں کی قصّے کہانیاں کیوں سناتے ہیں، اِس سے آپ کا مطلب؟"
نسیمہ نے مسکرا کر کہا۔

"مطلب ظاہر ہے ــــ کہیں تم بھی میرے بدنصیب دوست کی محبوبہ کی طرح بے وفا نہ بن جانا!"

"کاش تم مجھے سمجھ سکتے!"

"مَیں تمھیں بخوبی سمجھتا ہوں، بخوبی جانتا ہوں۔"

"میں سمجھتی ہوں، محبت عورت کی روح و رواں ہے، اپنی رُوح و رواں سے علیحدہ ہو کر وُہ زِندہ رہ سکتی ہے؟"

"یہی بات میں سُننا چاہتا تھا۔"

"تو سُن کر ہی چھوڑی، اور ارشاد؟"

"کچھ نہیں ــــ وُہ وقت کب آئے گا ــــ جب ہم ــــ"

"بہت جلد!"

یہ کہہ کر وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

ہم دونوں نیچے چلے گئے۔

دوسرے دن میں اپنی جنت سے نکل کر لاہور آگیا۔ کاش جلد سے جلد ملازمت مل جائے، اور میری سب سے عزیز آرزو پوری ہو!"

۱۲-جولائی ————!

مکمل ایک ماہ کے بعد آج قلم ہاتھ میں لیا ہے۔ ان تیس دنوں میں باوجود کوشش و خواہش کے بھی ڈائری میں ایک سطر کا اضافہ نہیں کر سکا، کالج کے زمانے میں سوائے پڑھائی کے اور کوئی کام نہ تھا۔ مگر اب تو مصروفیتیں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ گھبرا گیا ہوں، اور مزا یہ ہے کہ ابھی ملازمانہ زندگی کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ نہ معلوم اس دورِ حیات میں کیا حال ہو گا؟

ٹائپ رائیٹنگ سیکھنے کے بعد خانصاحب کے درِ دولت پر حاضر ہوا۔ بیحد خوش ہوئے اور طرح طرح کی امیدوں سے میرا دل بڑھانے لگے۔ جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو فرمایا "بیٹا! میرے مقدمے کے چند کاغذات ٹائپ کر دو"۔ جب تم یہ کام بخوبی کر سکتے ہو، تو پھر کسی اور کو کیونکر تکلیف دوں۔ ویسے میرا ایجا خوب

ٹائپ کرنا ہے، مگر میں چاہتا ہوں کہ جب تک تمھیں ملازمت نہیں ملتی۔ تمھاری جیب خرچ کے لئے کچھ نہ کچھ ہوتا رہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ معقول معاوضہ دُوں گا۔"

مَیں نے کہا "قبلہ! آپ خواہ مخواہ شرمندہ کرتے ہیں، معاوضہ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کاغذات دے دیجئے اور ٹائپ کی مشین کا بھی انتظام کر دیں۔ آپکی خدمت میری سعادت مندی ہے۔"

" یہ تمھاری برخورداری ہے، مگر معاوضہ ضرور دوں گا۔ کل گوبند رام سے مشین لے آنا۔ چند کاغذات ہیں، زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تمہاری رفتار تو کافی ہے — ہاں بھئی تمھاری والدہ بہت بے قرار رہتی ہیں، انہیں تسلی دیتے رہا کرو۔ نوکری بہت جلد مل جائے گی۔ اِس طرح گھبرانے سے کیا بنے گا۔ آج ہی میں لیجسلیٹو اسمبلی کے دو معزز رُکنوں سے مِلا تھا۔ اُن سے تمھارے متعلق بات چیت ہوتی رہی۔ امید ہے ہفتہ عشرہ تک انشاء اللہ تعالےٰ کام ہو جائے گا۔ خدا کی مہربانی چاہیئے۔ کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

میں گھر واپس آگیا اور دُوسرے دن خانصاحب سے چند کاغذات اور خانصاحب کا رقعہ لے کر گوبند رام سے ٹائپ کی مشین لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ جب یہ کاغذات ٹائپ ہو جائیں گے تو کام ختم ہو جائے گا۔ مگر خانصاحب نے تو کمال ہی

کر دیا۔ ہر روز دس بارہ کاغذ دینے لگے۔ ادھر امی بیمار پڑ گئیں۔ اور پھر ایک ٹیوشن کا کام الغرض بیس دن تک تو سر اُٹھانے کی بھی فرصت نہ ملی۔

کل امی جان کو صحت حاصل ہو گئی ہے، اور خانصاحب کا کام بھی ختم ہو گیا ہے کئی بار پوچھ چکے ہیں "بھئی کیا نذرانہ پیش کروں"؟ — میں ہر بار کہہ دیتا ہوں "قبلہ آپ شرمندہ نہ کریں"۔ اِن الفاظ کے سوا اور میں کہہ بھی کیا سکتا ہوں۔ گو یہ الفاظ صرف زبان سے نکلتے ہیں، دل سے نہیں۔ اگر میں نے کام کیا ہے تو اس کا معاوضہ کیوں نہ ملے۔ میں خود بے شرم بن کر کہوں، خانصاحب مجھے معاوضہ دیجئے۔ خانصاحب خود نہیں جانتے — خیر دل کو تسلی دی ہے کہ چلو یہ رشوت ہی سہی۔ آخر وُہ بھی تو میری ملازمت کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔

والد صاحب کی وفات کے بعد ہمارے تمام اخراجات کے کفیل ماموں جان ہیں ماموں جان قبلہ والد صاحب سے بھی زیادہ رحمدل اور شفیق ہیں، مگر ان کی نئی بیوی ہم سے دُور دُور رہنا چاہتی ہے۔ ہم سب لوگ اس کی عزت کرتے ہیں، اس کے ہر حکم کو مانتے ہیں، پھر بھی وُہ ناراض ہی رہتی ہے — مگر مجھے اس کی ناراضگی کی پروا نہیں — جیسے ہی مجھے ملازمت ملتی ہے، ہماری سب محتاجی دُور ہو جاتی ہے۔ پھر ممانی صاحبہ جائیں بھاڑ میں۔

کل پانچ بجے میری پیاری کا خط بھی آیا ہے۔ خط چار صفحوں پر پھیلا ہوا ہے پھر بھی آخر میں لکھا ہے :۔ "جی چاہتا ہے چار پانچ صفحے اور لکھ ڈالوں، مگر ڈرتی ہوں کہیں تم اکتا نہ جاؤ۔"

۲۹۔ جولائی ———————— !

میں نے سمجھا تھا کہ ملازمت کے لئے زیادہ دقّتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں، ایک تو میں محنتی ہوں اور ملازمت کے تمام فرائض ادا کرنے پر مستعد، دوسرے خانصاحب اور میاں صاحب نے یقین دلا دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تم ایک ماہ تک برسرِ روزگار ہو جاؤ گے ــــ مگر اب یہ حال ہے کہ خانصاحب کے پاس جاتا ہوں تو وُہ کہدیتے ہیں۔ "برخوردار! ذرا صبر کرو۔ بڑے بڑے آدمیوں سے کہہ رکھا ہے" ــــ اور میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو وہ کہدیتے ہیں۔ "خانصاحب بہت بڑے آدمی ہیں۔ ان کے پاس آتے جاتے رہا کرو۔"

پرسوں میں نے غصّے کے عالم میں سول ملٹری اور ٹربیون کے کالم پڑھ کر بیس مختلف جگہوں پر درخواستیں بھیج دی ہیں دیکھئے کیا نتیجہ برآمد ہو ــــ بعض جگہوں پر تو صرف انٹرنس پاس امیدواروں کی ضرورت ہے اور میں بی، اے ہوں۔ امید واثق ہے کہ کہیں نہ کہیں ذریعۂ معاش پیدا ہو جائے گا۔

کل والدہ نے کئی بار کہا۔ "خالصاحب دہلی جارہے ہیں، وہاں وہ پندرہ روز رہیں گے، ابھی جاکر اُن سے ملاقات کرلو۔"

مَیں نے انکار کردیا اور صاف صاف کہدیا۔ "خالصاحب بہت مغرور انسان ہیں۔ میں کیوں اُن کے پیچھے پیچھے بھاگتا پھروں۔" والدہ قدرے ناراض ہو گئی ہیں۔

رات طرح طرح کے سہاؤنے خواب آتے رہے ـــ کبھی دیکھتا کہ ایک نہایت صاف ستھرے کمرے میں کرسی پر بیٹھا ہوں، سامنے میز پر کاغذوں کا انبار پڑا ہے۔ اتنے میں چپڑاسی نوٹوں کا بنڈل دے کر تنخواہ کی رسید لیتا ہے۔ میں بنڈل جیب میں ڈال لیتا ہوں اور جیسے ہی چار بجتے ہیں، تانگہ میں بیٹھ کر گھر آجاتا ہوں، اور آتے ہی نوٹ والدہ کے پاؤں پر رکھ دیتا ہوں۔ والدہ میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہتی ہیں ـــ "جیتے رہو برخوردار!"

کبھی دیکھتا ہوں، کہ گھر ذرا دیر سے پہنچا ہوں ـــ نسیمہ مجھے دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر پلنگ پر چلی جاتی ہے اور مُنہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔ مَیں کہتا ہوں "آج ذرا سینما گیا تھا۔ تم تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو ـــ"

"ناراض کیوں نہ ہُوں! لو نے دس ہو گئے۔"

"تو کیا کروں، اگر مہینے میں ایک دو دفعہ سینما نہ جاؤں تو دوست کیا کہیں گے۔"

"کیا کہیں گے؟"

"کنجوس، زن مرید اور نہ معلوم کیا کیا؟"

"ہوں، دوست کہیں گے!"

میں پیار سے اپنے ہاتھ اس کی گردن میں حمائل کر دیتا ہوں۔

گجرات میں پھوپھی کے لڑکے کی شادی تھی۔ والدہ تو بہنوں کو ساتھ لے کر اتوار کو روانہ ہو گئیں، مگر مجھے چمن رام بیرسٹر سے ملازمت کے سلسلے میں ملاقات کرنی تھی، اس لئے میں تیسرے دن گجرات کو روانہ ہوا۔ تمام رشتہ دار جمع تھے۔ ہر ایک مجھ سے بڑے احترام کے ساتھ پیش آیا۔ پھوپھا صاحب نے تو میری تعریف کچھ اس پیرائے میں کی کہ مجھے بھی اپنی گوناگوں خصوصیات کے متعلق شبہہ سا پیدا ہو گیا خدا کرے میں اپنے عزیزوں کی تمام مرادیں پوری کر دوں —— ابھی ملازمت ملی نہیں مگر یہ لوگ کئی امیدیں میری ذات سے وابستہ کر چکے ہیں — کسی کو امید ہے کہ میں ملازم ہوتے ہی اس کے لڑکے کو اپنے دفتر میں رکھوا لوں گا، اور کسی کو گمان ہے کہ میں اسکی مالی امداد کروں گا۔

تعلیم ایک نعمت ہے، مگر خاندان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہونا خطرے سے خالی نہیں!

شام کو نسیمہ سے ملاقات ہو گئی۔ کہنے لگی

"سب لوگ آپ کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں"

"اور تم؟"

"میری بات چھوڑو!"

"مگر میں تو تمھارا ہوں' اور تم!"

"تم کو تو ان باتوں کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں، — ملازمت کا کیا حال ہے؟"

"بہت بُرا"

"پھر وُہی مذاق، اچھا یونہی سہی — میں جاتی ہوں"

مَیں نے اُسے یقین دلایا کہ ملازمت کے لئے انتہائی کوشش کر رہا ہُوں۔ امید ہے چند دن تک کامیاب ہو جاؤں گا!

آج ہی گجرات سے واپس آیا ہوں۔ کسی درخواست کا جواب نہیں آیا — والدہ صبح سے تین بار پوچھ چکی ہیں۔ "کچھ ہوا درخواستوں کا؟" میں کہہ دیتا ہوں"، ابھی کچھ نہیں مگر ہو جائے گا"

۲۷۔ نومبر ——————— !

چار مہینے گزر گئے۔ اور اس عرصے میں جتنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، اس کا اندازہ میرا دِل ہی لگا سکتا ہے۔ صبح خانصاحب کے درِ دولت پر حاضر ہو رہا ہوں تو

شام کو میاں صاحب کی خدمت میں باریاب ہوں۔ دوپہر کو بیرسٹر صاحب سے ملاقات کی ہے تو پچھلے پہر ٹھیکے دار صاحب کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔ اور اس تگ و دو، جد و جہد اور دوڑ دھوپ کا نتیجہ؟ خاک بھی نہیں، ہر طرف سے وعدے کئے جا رہے ہیں ــ صرف وعدے!

پہلے پہل تو میرے مہربان بزرگ تسلی و تشفی دیتے رہتے تھے۔ مگر اب تو مجھے دیکھتے ہی ان کے ماتھے پہ تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، اور جب وہ مجھ سے گفتگو کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اپنے مخاطب سے انتہائی طور پر بیزار ہیں ـــ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ میں خانصاحب یا بیرسٹر صاحب کی کوٹھی پہ گیا ہوں نوکر سے اطلاع دینے کے لئے کہا ہے۔ ایک دو گھنٹے بیتابی سے انتظار کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو کہیں باہر چلے گئے، اور مزا یہ ہے کہ کئی دفعہ میرے سامنے جلدی جلدی موٹر میں بیٹھتے ہیں۔ مگر مجھ میں اتنی جرأت کہاں کہ ان کے پاس پہنچوں اور یاد دہانی کراؤں ــ عجیب زندگی ہے میری بھی ـــ سوچتا ہوں کیا ذریعۂ معاش تلاش کرنے والا اتنا برا ہو جاتا ہے کہ یہ بڑے بڑے لوگ اس سے دور رہنے پر مجبور ہو جائیں؟

بیس مختلف جگہوں پر بیس کے قریب عرضیاں بھیجی تھیں، گیارہ کے جواب ملے

مگر نوعرضیاں نہ معلوم کہاں گم ہو گئیں ـــــ چار دفتروں سے انٹرویو کے لئے اطلاع دی گئی تھی یکے بعد دیگرے اِن چار جگہوں پر گیا۔ ممتحنوں کے جوابات اپنی قابلیت و اہلیت کے مطابق دیئے۔ مگر کسی جگہ سے بھی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ آج کل سفارش اور ''ہائی فیملی'' کی سند کی ضرورت ہے۔ مگر میں یہ دونوں چیزیں کہاں سے لاؤں؟ ایک غریب خاندان کا فرد فطرۃً ان دونوں خوبیوں سے محروم ہوتا ہے۔

ماموں جان بھی مجھ سے بدگمان ہو گئے ہیں۔ وُہ سمجھتے ہیں کہ میں جان بوجھ کر وقت ضائع کر رہا ہوں، مجھے آوارہ گردی کی عادت ہے، درآنحالکہ ملازمت کے لئے میرا دل تڑپ رہا ہے ـــ اور ہر وقت تڑپتا رہتا ہے۔

کوشِش کر رہا ہُوں، خدا کہیں نہ کہیں ضرور کامیاب کر دیگا۔

۱۵۔ دسمبر

معلوم ہوتا ہے، کامیابی کو میری کوششوں کے ساتھ دشمنی ہے۔ اگر یہ بات نہیں تو پھر ہر جگہ ناکامی کا سامنا کیوں کرنا پڑتا ہے۔ ہر جگہ مایوسی کا بھیانک چہرہ ہی کیوں دکھائی دیتا ہے۔

نوکری کی تلاش میں ایسے ایسے دفتروں میں پہنچا ہوں، جن کے نام بھی کبھی نہیں سنے تھے۔ ایسے ایسے لوگوں کے گھروں میں جاتا ہوں، جن کی شکل بھی کبھی

خواب میں نہیں دیکھی تھی اور ایسی ایسی حرکتیں کرنے پر مجبور ہوں، جن کا تصور بھی کبھی ذہن میں نہیں آیا تھا۔ مگر سب بے سود۔ پرسوں ایک سفید ریش وکیل صاحب نے بتایا۔ کل دس بجے کے قریب رام لال اشٹام فروش کی دکان پر پہنچ جانا۔ کچہری میں ایک آسامی خالی ہے۔ وہاں تمہارا کام ہو جائے گا۔ میں ساڑھے نو بجے ہی ایک تازہ آرزو لیئے کچہری میں پہنچ گیا۔ پہلے دو گھنٹے اشٹام فروش کی دکان پر بیٹھا رہا۔ پھر اشٹام فروش کے عقب میں باغ میں چلا گیا۔ خدا خدا کر کے وکیل صاحب آئے۔ میں دوڑ کر باغ سے نکلا اور وکیل صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا "چند منٹ اور انتظار کریں، پہلے اس کا کام کر لوں۔" یہ کہکر انہوں نے اشٹام فروش سے کچھ لکھوایا اور اس پر اپنے ساتھی کا انگوٹھا لگوایا اور پھر دونو غائب ہو گئے۔

میں ناچار میز کے ایک گوشے پر بیٹھ گیا۔ دو بجے کے قریب وکیل صاحب آئے۔ اور مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کر کے آگے آگے چلنے لگے —— کئی کمروں سے گزرنے کے بعد ہم سڑک پر پہنچے اور پھر عدالتِ خفیفہ میں۔ وہاں وکیل صاحب اپنے کسی مؤکل سے باتیں کرنے لگے۔ جب فارغ ہوئے تو میری طرف دیکھ کر فرمانے لگے۔

"آج تو رام داس ملا نہیں، کل سہی"۔

"بہتر —— مگر وہ نوکری کیسی ہے؟"

"نوکری ـــــ؟ ایک نوکری ہے ـــــ نوکری نہیں چاہیئے؟"

"کیوں نہیں قبلہ!"

"تو پھر جرح کا مطلب ـــــ تمام دِن گدھوں سے سر کھپانا پڑتا ہے ـــــ بابا ایک بار تو کہہ دیا۔ وُہ بے ایمان آج یہاں نہیں، کہیں دفع دفان ہو گیا ہے۔"

یہ کہکر وکیل صاحب ایک اشٹام فروش کی دکان پر بیٹھ کر حقے کے کش لگانے لگے۔ میرے دِل کو سخت صدمہ پہنچا اَور مَیں عدالت سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جیسے ہی گھر کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ دِل ڈوبنے لگا۔ پاؤں بوجھل ہو گئے اَور ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو گیا۔ خیر اُوپر پہنچا اَور ٹوپی اُتار کر صندوق پر دے ماری۔ ماں سمجھ گئی کہ ناکام واپس آیا ہے۔

"روٹی ہے امّی؟"

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ آج ہوُا کیا ـــــ ہو گیا کام؟"

"نہیں، بالکل نہیں!"

"کوشش بھی کرو۔"

یہ فقرہ نشتر بن کر میرے دل میں اُتر گیا۔ صبح سے لیکر تین بجے تک کچہری کی خاک چھانتا رہا اور اس عرصے میں نلکے کے پانی کے سوا پیٹ میں اَور کچھ بھی

نہیں گیا، پھر بھی ماں کہتی ہیں، کوشش بھی کرو۔ آخر یہ کوشش نہیں تو پھر کوشش کسے کہتے ہیں، میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

"تم یونہی خفا ہو گئے۔ غصہ نہ کر میرے لال! آج نہیں تو کل سہی، پرسوں سہی، کبھی نہ کبھی تو خدا ہماری بھی سنے گا" یہ کہتے ہوئے ماں میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

وہ تلخ احساس جو کئی ماہ سے میرے ذہن میں نشتر چبھو رہا تھا اور تلخ ہو گیا۔ میں سوچنے لگا "نوکری کے لئے بڑے بڑے آدمیوں سے ملا ہوں، ان کی منت سماجت کی ہے، ان کے کام کئے ہیں، کئی کئی گھنٹے اُن کے در دولت پر کھڑا رہا ہوں، ان کے بچوں کو مفت پڑھاتا رہا ہوں اور جہاں جہاں انہوں نے اشارہ کیا ہے، وہیں وہیں پہنچا ہوں۔ پھر بھی ناکامی، پیہم ناکامی ــــ اگر میں امیر گھرانے کا فرد ہوتا تو بڑی سے بڑی ملازمت کے لئے میری خواہش ہی سب سے بڑی کوشش ہوتی۔ مگر اب میں ایک تنگدست، مفلس خاندان کا رکن ہوں، اس لئے میری جان توڑ کوشش کو بھی کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کتنا بڑا فرق ہے امیر اور غریب میں ــــ ایک کچھ بھی نہیں کرتا ہے، پھر بھی اسے سب کچھ مل جاتا ہے۔ دوسرا سب کچھ کرتا ہے، پھر بھی اسے کچھ نہیں ملتا۔

ماں! تجھے کیونکر بتاؤں کہ نوکری کے لئے مَیں نے کیا کچھ کیا ہے۔ تو سمجھتی ہے ـــــ ہر شخص سمجھتا ہے کہ مجھے آوارہ گردی کا شوق ہے، آہ! مَیں تم کو اور دُوسروں کو کیونکر بتاؤں کہ جب دن بھر اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد رات کو بستر پر لیٹتا ہُوں تو میری کیا حالت ہوتی ہے ـــــ دن بھر اِدھر اُدھر پھرنے کی وجہ سے دماغ میں ٹیسیں سی اُٹھتی رہتی ہیں۔ پاؤں کے تلووں میں آگ سی بھڑک اُٹھتی ہے اور بدن کے عضو عضو میں درد محسوس ہوتا ہے۔ مگر دُنیا کیا جانے ـــــ اور دُنیا کو جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے"۔

کل نسیمہ کا خط آیا تھا۔ اِن مصیبتوں کی تاریکی میں نسیمہ ہی روشنی پھیلا رہی ہے۔

۲۹۔ دسمبر ـــــــــــــــــــ !

کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ کہیں بھی ملازمت نہیں ملتی۔ اور ایج (OVER AGE) ہونے میں صرف ایک مہینہ باقی رہ گیا ہے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کی ملازمتوں کے تمام دروازے مجھ پر بند ہو جائیں گے۔ دوست بار بار کہتے ہیں اور بڑی ہمدردی کے لہجے میں کہتے ہیں "جلدی سے نوکری کر لو۔ بعد میں کہیں بھی نوکری نہیں ملیگی اور پرائیویٹ فرموں میں نوکر ہونا اور نہ ہونا ایک ہی برابر ہے"۔ کسی نے ماں سے بھی کہدیا ہے کہ اگر ایک مہینہ اور گزر گیا اور

سلیم کو نوکری نہ ملی تو پھر اُسے کہیں بھی نوکری نہیں ملے گی۔ یہ گورنمنٹ کا "رول" ہے۔ ماں بہت مضطرب ہے اَور یہ امر میری پریشانی کو بڑھا رہا ہے۔

ارادہ ہے، رات کو دو تین بجے تک عرضیاں لکھ ڈالوں اَور صبح انہیں پوسٹ کر کے ہر ایک دفتر میں جاؤں — یہ ہے کل کا پروگرام۔

رشتہ دار اب عزّت و احترام سے ملنا تو کُجا، بولتے تک بھی نہیں، کیوں؟ وجہ ظاہر ہے، سوسائٹی میں ملازمت دیکھی جاتی ہے، شرافت نہیں، پھر میرے ساتھ کیوں نہ ایسا سلوک کیا جائے؟

ماموں جان تو مجھ سے اس قدر ناراض ہیں کہ بولتے بھی نہیں، جو بات کرنی ہوتی ہے وُہ ماں سے کہدیتے ہیں اَور ماں مجھے بتا دیتی ہے۔ اُف! کیسے کیسے تغیر رونما ہو رہے ہیں!

۱۸۔جنوری ——————— !

وقت گزرتا جا رہا ہے —— انتہائی تیزی، انتہائی بے رحمی کے ساتھ گزرتا جا رہا ہے —— سورج نکلتا ہے تو زندگی کی ایک اور رات کم ہو جاتی ہے — چاند طلوع ہوتا ہے تو زندگی سے ایک اَور دِن گھٹ جاتا ہے۔ ہر لمحہ ایک دیرینہ آرزو سینے کی گہرائیوں میں دم توڑ دیتی ہے اَور ہر گھڑی ایک تازہ

مگر ضعیف سی تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا دن اسی طرح گزرتے جائیں گے؟ کیا راتیں اِسی طرح بیت جائینگی؟

مہینے کے تیس دنوں میں سے صرف دس دن باقی رہ گئے — دس دفعہ آفتاب طلوع ہو گا — دس دفعہ چاند طلوع ہو گا اور پھر، یا تو قسمت چمک اٹھیگی یا میری تیرہ بختی مجھ سے تمام امیدیں چھین لیگی — خدا ہی جانے میری مسلسل کوششوں کا انجام کیا ہو گا!

ابھی ابھی نسیمہ کا خط آیا ہے۔ لکھا ہے "میری ماں تم سے مایوس ہو چکی ہیں وہ ایک دو ماہ اور انتظار کرینگی، پھر — میں کیا بتاؤں پھر کیا ہو گا — تم خود جانتے ہو۔ خدا کے لئے لگاتار کوشش کرو۔ تم نہیں جانتے، میرے دل کو کتنا صدمہ پہنچے گا۔"

میں جانتا ہوں، سب کچھ جانتا ہوں، خدا نے مجھے پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ دلخراش باتیں جانتا رہوں۔ دل پر ایک چرکہ لگتا ہے اور وہ ابھی مندمل نہیں ہوتا کہ دوسرا چرکہ آ لگتا ہے — مگر یہ چرکہ — اُف میرے آقا! یہ چرکہ تو میں برداشت نہیں کر سکتا — برداشت نہیں کر سکونگا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنی نسیمہ سے جدا ہو کر زندہ رہوں — وہ میرے پاس نہیں مگر امید

تو ہے کہ وہ میری ہے۔ یہی امید میری زندگی کا سہارا ہے — جب یہ سہارا جاتا رہا تو پھر زندگی کا شیشہ کیونکر سلامت رہ سکے گا۔

مجھ سے سب کچھ چھن جائے۔ مگر نسیمہ، میری نسیمہ میری نسیمہ ہی رہے۔

آہ اس نے یہ کیا کہہ دیا — اسے کیا ہو گیا — وہ بھی قسمت کی طرح سنگ دل ہو گئی —؟

دل ڈوب رہا ہے — آقا رحم کر!

۲۹- جنوری —————————!

بقیہ دس دن بھی گزر گئے۔ میری عمر پچیس سال کی آخری حد کو بھی عبور کر چکی — اب گورنمنٹ کی ملازمت کے تمام دروازے بند ہیں — قسمت کس کس طریقے سے میرا تمسخر اُڑا رہی ہے — زمانہ کس کس انداز سے مجھے رسوا کر رہا ہے:-

چودہ سال تک سکولوں اور کالجوں میں دماغ پاشی کرتا رہا — موٹی موٹی کتابوں نے رگوں سے خون نچوڑ لیا — چراغ کی روشنی نے آنکھوں کا نور چوس لیا۔ تعلیم کے اخراجات نے ماں کے بچے کھچے گہنوں کا بھی صفایا کر دیا اور ان سب کا نتیجہ ؟ چند موٹے موٹے کاغذات، جنہیں دنیا سرٹیفکیٹ اور ڈگریاں کہتی ہے۔ ان کاغذوں کو لے کر آٹھ نو ماہ تک مختلف دفتروں میں گھومتا رہا، مگر یہ سرٹیفکیٹ، یہ ڈگریاں صرف خالی کاغذ ہی ثابت ہوئیں۔

مجھے بتایا گیا کہ وہ سامنے تمہاری مسرتوں اور کامیابیوں کی جنت ہے۔ مگر اس کا دروازہ بند ہے، تم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاؤ۔ میں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، اُسے دھکیلا، قفل میں اپنی ٹوٹی پھوٹی چابی لگائی اور ابھی اس کوشش میں مصروف تھا کہ معلوم ہوا، وقت گزر چکا ہے اور اب میں اپنی جنت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا گیا ہوں۔

میں دیکھتا تھا کہ میرے ساتھی بھی اپنی اپنی جنتوں کے دروازوں پہ کھڑے ہیں۔ مگر خود کچھ بھی نہیں کرتے، اُن کے آباد اجداد دروازے کھول رہے ہیں۔ اور وہ قہقہے لگاتے ہوئے دروازوں میں سے گزر رہے ہیں —— یہ کیسا اندھا انصاف ہے، یہ کیسا خونخوار فیصلہ ہے، یہ کیسا ظالم رویّہ ہے!

امّی نے کل سے روٹی نہیں کھائی، بہنیں بہت افسردہ ہیں اور ماموں چیں بجبیں، آخر میرا قصور؟

کل نسیمہ کا خط آیا تھا لکھا ہے "گورنمنٹ کی ملازمت نہیں ملی تو کیا ہوا کسی پرائیویٹ فرم میں کام کر لو۔ اصل مقصد تو تنخواہ سے ہے، گورنمنٹ کے محکمے میں نہ کام کیا پرائیویٹ فرم میں کر لیا تمہارے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت افسردہ ہو گئے ہو۔ سلیم پیارے! مردانہ ہمت سے کام لو دُنیا میں تکلیفیں آتی ہی رہتی ہیں۔"

خدا تمھاری مدد کرے۔ اگر تم نے پوری ہمت سے کام نہ لیا تو میں ناراض ہو جاؤنگی پھر شکوے نہ کرنا۔"

سوچتا ہوں اگر قسمت کے اس بھیانک اندھیرے میں یہ مشعل بھی بجھ گئی تو پھر کیا ہو گا؟

۲۷۔ فروری

دو تین روز سے امّی اور بہنیں بہت افسردہ نظر آ رہی تھیں اور جب پرسوں آپا سسرال سے آئیں تو ان کے ساتھ امّی نے اس طرح سرگوشی میں باتیں کیں کہ مجھے معلوم ہو گیا کوئی نہایت اہم واقعہ رونما ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسی دن میں نے آپا سے پوچھا۔ "یہ چپکے چپکے کیا باتیں ہوتی رہتی ہیں، مجھے بھی کچھ معلوم ہو"

"کوئی خاص بات نہیں سلیم! امی کہتی ہیں۔ اب تمھاری شادی کر دی جائے۔ رشتے کی تلاش ہے، ہر روز رشتے تو آتے ہیں مگر......"

"رشتے کی تلاش؟ میں نے پوچھا۔

"کیوں رشتہ تلاش نہ کیا جائے۔ تمھارے ماموں اب تم پر ناراض نہیں وہ تمھاری مجبوریوں کو سمجھ چکے ہیں۔"

"صاف صاف کیوں نہیں کہتیں آپا! یہ معمّہ کیا ہے؟"

"معمہ کیا ہونا ہے، اُس کی تو شادی ہو رہی ہے۔ اِس لئے ......"

"کس کی شادی؟ اُس ڈائن نسیمہ کی؟

یہ الفاظ سُن کر مجھے یوں محسوس ہوُا کہ میرے سر سے موٹر کا پہیہ گزر گیا ہے یا میں پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکتا ہوُا نیچے آ رہا ہوں۔

"لڑکیاں ہزاروں، ایک سے ایک بڑھکر" امی کہتی ہوئی آئیں

مجھے معلوم نہیں اس کے بعد انہوں نے کیا کہا۔ میرے سامنے کبھی امی کے ہونٹ ہلتے تھے اور کبھی آپا کے ــــ وُہ کیا کہہ رہی تھیں، یہ میں نہیں سُن سکا۔ مَیں وہاں سے اُٹھا اور کمرے میں پلنگ پر آ کر لیٹ گیا۔

شام تک پلنگ پر مُردے کی طرح پڑا رہا۔ شام کے بعد رضیہ ایک مٹیالے رنگ کا لفافہ لائی۔ پتہ کی تحریر دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا، یہ خط نسیمہ کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اندر لکھا تھا:۔

میں اب کس لفظ سے تم کو مخاطب کروں؟ کوئی لفظ نہیں سوجھتا ــــ خیر سُنو۔ میں نے سمجھا تھا کہ تم میرے ہو۔ مگر دشمنوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ تم کو یقین تھا کہ میں تمہاری ہوں، مگر میں تمہاری نہیں بن سکی۔ آج شام کو میرا نکاح ہو رہا ہے۔ میری دُنیا ہمیشہ کے لئے تاریک ہو رہی ہے۔ میری زندگی کا باغ

اُجاڑا جا رہا ہے اور میری مسرتیں پامال کی جا رہی ہیں۔ شکوہ کروں تو کس سے، فریاد کروں تو کیونکر ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے!
گھُٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

یہ سب کچھ سہی مگر میرے سلیم! میرے اپنے سلیم! خدا کے لئے کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا جس سے میرے دل کو صدمہ پہنچے۔ دُنیا نے مجھے کافی صدمہ پہنچایا ہے، تم تو دنیا کا ساتھ نہ دینا —— میری آرزو یہ ہے —— تمہاری نسیمہ کی آرزو یہ ہے کہ تم پچھلے واقعات کو بھلا دو، اور جیسے ہی کہیں نوکری ملے، شادی کر لو مجھے بڑی تمنا ہے کہ اپنی بہن کو دیکھوں —— دیکھنا میری آرزو کو پامال نہ کرنا، ورنہ میرے دل کو سخت صدمہ پہنچے گا —— اور تم تو کبھی بھی اپنی نسیمہ کو اتنا صدمہ نہیں پہنچاؤ گے۔ اب الوداع!

نسیمہ

خط پڑھتے ہی دل میں آگ سی لگ گئی —— دماغ پگھلتا ہوا لوہا بن گیا۔ اُٹھنے کی کوشش کی مگر امّی اور آپا نے بازو پکڑ لئے۔ نصف رات کے قریب میرے ہوش و حواس ٹھکانے لگے۔ لیکن رات بخار کی شدت میں ہذیان بکتا رہا۔

کل تمام دن بخار میں جلتا رہا۔ اب بھی ۱۰۴ درجے کا بخار ہے۔ آہ اس مختصر سے عرصے میں کیا کچھ ہو گیا ـــــــ

وہ شمع جو میری مایوس و تاریک زندگی میں روشن تھی، ہمیشہ کے لئے بجھ گئی، وہ تمنا جو میرے ویران سینے میں لہرا رہی تھی پامال ہو گئی اور وہ آخری مسرت، جو میری زندگی کا سہارا تھی، مجھ سے چھین لی گئی۔ اب ہر وقت تاریکی ہی تاریکی ــــ مایوسی ہی مایوسی ہے۔

۱۵۔ اگست ـــــــــــــــ!

اگر سانس کی آمد و شد پر زندگی کا انحصار ہے تو بیشک میں زندہ ہوں اور دُنیا کو حق حاصل ہے کہ مجھے زندہ سمجھے، اور اگر زندگی عبارت ہے جوشِ عمل اور سرگرمی سے تو پھر میں سانس لیتا ہوا، بولتا چالتا ہوا، چلتا پھرتا ہوا ایک لاشۂ بیجان ہوں ـــ سینہ ویران، دل مایوسی کے اندھیرے میں سویا ہوا اور دماغ سمجھنے سوچنے سے یکسر قاصر ـــ کیا اسی کا نام زندگی ہے ـــ کیا زندہ لوگوں کی یہی خصوصیات ہوتی ہیں؟ ـــ دل میں کوئی آرزو نہیں ـــ سینے میں ذرہ بھر حرارت نہیں، رُوح میں ہلکی سی بھی روشنی نہیں ـــ دُنیا کے سمندر میں ایک جلے ہوئے جہاز کے نیم سوختہ تختے کی مانند بہا جا رہا ہوں اور نہ معلوم کب

تک بہتا چلا جاؤں گا۔

دُنیا میں ہر قدم پر شکست ہوئی مگر ہمت نہیں ہاری، کوشش کرتا رہا۔ مگر یہ شکست — آہ یہ شکست تو میری جان لے کر چھوڑیگی — میری نسیمہ، میری زندگی کی زندگی، میری دُنیا کی روشنی ہی مجھ سے چھن گئی تو پھر میں جی کر کیا لوں؟ — دنیا میں رہ کر کیا کروں؟

امی جب مادرانہ شفقت سے لبریز نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہیں تو دل میں ایک چبھن سی ہونے لگتی ہے۔ سنبھلنے کی سعی کرتا ہوں اور سنبھل بھی جاتا ہوں مگر یہ حالت بہت کم عرصے کے لئے رہتی ہے — میں کیا کروں؟ دل کا زخم گہرا ہی ہوتا جا رہا ہے — سینے کا داغ پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔

۱۹۔ اگست

جب دِل کا چراغ بجھ جائے تو زندگی کیسی؟ زندگی تو نام ہے سینے کی گرمی، دل کی حرارت اور روح کی روشنی کا! اور میں ان سب سے محروم کر دیا گیا ہوں۔ لوگ مجھے زندہ سمجھیں، مگر میں زندہ نہیں، مُردہ ہوں — بلکہ مُردوں سے بھی بدتر حالت میں ہوں۔

یہی وہ محبوب جگہ ہے جہاں میں نے اور نسیمہ نے بیٹھ کر گھنٹوں میٹھی میٹھی

باتیں کی ہیں مگر اب یہ جگہ کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ نہ رات کو نیند آتی ہے نہ دن کو چین، نہ معلوم کب تک اسی طرح تڑپتا رہوں گا۔

میری نسیمہ کا کیا حال ہو گا؟ وہ بے چاری بھی تڑپ رہی ہو گی —— دشمنوں نے دو محبت کرنیوالے دِلوں کے درمیان ایسی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے قریب تک بھی نہیں جا سکتے۔ دنیا چاہتی ہے کہ اب دونوں تڑپتے رہیں —— اسی طرح تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیں!

۲۹- اگست ——————!

مُدّت ہوئی کہ چشمِ تحیّر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

وُہی دن، وُہی راتیں، وُہی دِل، وُہی پیہم افسردگی — کوئی تغیر نہیں، کوئی انقلاب نہیں۔ چاروں طرف بھیانک تاریکی چھائی ہوئی ہے —— چاروں طرف ڈراؤنی ویرانی مسلّط ہے۔

کیا کروں، میرے اللہ! میں کیا کروں —— زندگی کا رشتہ ٹوٹ کیوں نہیں جاتا؟ ان سانسوں کا کھیل ختم کیوں نہیں ہو جاتا؟ —— ایک دائمی میٹھی نیند —— یہی آرزو ہے —— یہی تمنا ہے!

۳۰ اگست ________________ !

رات سر میں شدید درد تھا، اور میں انتہائی بیقراری کے عالم میں کوٹھے

پر ٹہل رہا تھا کہ قریب کے مکان سے آواز آئی :۔

اے غمِ یار ترے دم سے ہے تعمیرِ حیات

تو سلامت ہے تو دُنیا مِری برباد نہیں !

شعر سُنتے ہی دِل پر ایک چرکہ سا لگا۔ آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ میں

چارپائی پر بیٹھ گیا اور سر دیوار سے لگا دیا۔

کچھ دیر بعد ماں کی آواز آئی

" بیٹا سوتے کیوں نہیں، اِتنی رات گزر گئی۔ سو رہو بیٹا !"

مَیں نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دئے، مگر ماں نے آنسو دیکھ لئے تھے۔ پاس آ

کر کہنے لگیں :۔

" سلیم ! تو نے مجھے جیتے جی ہی مار ڈالا، کیا ہو گیا ہے تجھے ؟"

امّی کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں کی جھُریوں میں لرزنے لگے، میرا دل

اَور بھر آیا ــ سیلاب کا بند ٹوٹ گیا اور میں دونوں ہاتھوں سے چہرے کو

ڈھانپ کر سِسکیاں بھرنے لگا۔ جی چاہتا تھا، اِتنا روؤں کہ خود ہی ان آنسوؤں

کی لہروں میں بہ جاؤں۔ ماں نے گلے سے لگا لیا اور کہنے لگیں

"پاگل ہے تو — بالکل پاگل ہے۔"

میرا دل ایک بات کہنے کیلئے تڑپ رہا تھا۔ میں نے ماں کے قدموں پر سر رکھ دیا۔" امّی! میں نے تجھے بہت ستایا۔ بڑا دکھ دیا تیرے دل کو — کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا یا پیدا ہوا تھا تو بچپن ہی میں مر جاتا۔"

ماں میری پیشانی چوم کر کہنے لگی۔

"یہ لفظ نہ کہو بیٹا! تو نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا — قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے! اب میرے لال، ان باتوں کو بھلا دے۔ خدا ایک دروازہ بند کرتا ہے تو دس دروازے کھول بھی دیتا ہے — میرے بچّے! اس طرح گھُل گھُل کر مرنا، اور دوسروں کو مارنا کوئی عقل مندی نہیں۔ تو سیانا ہے پڑھا لکھا ہے سب کچھ جانتا ہے۔ پھر ایسی باتیں، ایسی حرکتیں — اگر تیرا یہی حال رہا تو میں زندہ ہی گور میں چلی گئی۔ دیکھو تمہاری بہنیں مجھ سے اچھی طرح بولتی بھی نہیں۔ وہ مجھ سے لڑتی ہیں کہ بھائی جان کی شادی کیوں نہیں کرتیں۔ ان بیچاریوں نے دنیا میں کونسی خوشی دیکھی ہے — باپ دنیا میں نہیں، جو پیار اور محبت سے ان کے سر پہ ہاتھ رکھے — بھائی بے کار ہے اور دکھی ہے، ماں

نصیبوں جلی، دُکھوں کی ماری ـــــ کدھر جائیں؟"

ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں۔ مجھے پھر اپنے دل پر قابو نہ رہا۔ بے اختیار رونے لگا اور دیر تک روتا رہا۔

رات مجھے معلوم ہوا کہ میں سخت خود غرض انسان ہوں ـــــ میں بڑی بیرحمی کے ساتھ اپنی پیاری ماں، اپنی پیاری بہنوں کی تمناؤں کا خون کر رہا ہوں۔ اگر میں نے ہی اُن کے دِل کو دُکھایا تو پھر دنیا میں کون ان کو راحت پہنچائیگا۔ کتنا ظالم ہوں ـــــ کس قدر خود غرض ہوں ـــــ مجھے اپنی زندگی سے شدید نفرت ہوگئی۔

۷ ستمبر ـــــــــــــــــــــــ!

کل دن بھر اماں جی، ماموں جان اور بہنوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ ماں خوش ہے، ماموں خوش ہے اور بہنیں تو بے حد خوش ہیں ـــــ میں اپنے زخموں کو سینے میں دبا کر ہنسنے کی کوشش کر رہا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔

مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنی ناکامیوں سے متاثر ہو کر ان ہستیوں کی تمناؤں کا خون کردوں جنہوں نے میری خوشی کے لئے دنیا کی ہر تکلیف کا سامنا کیا ـــــ دُنیا کی ہر مصیبت کو بخندہ پیشانی برداشت کیا۔

صبح ایک دوست کے ساتھ جو ایک اُردو اخبار میں کام کرتے ہیں، اخبار کے دفتر میں گیا۔ چیف ایڈیٹر صاحب نے جو اخبار کے مالک بھی ہیں مجھ سے سات خبروں کا ترجمہ کرایا اور اس طرح امتحان لے کر مجھے عملے میں شامل کر لیا۔

"ڈیوٹی" رات کو ملی ہے — آٹھ بجے سے لے کر بارہ بجے تک — تنخواہ کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ کہتے تھے تنخواہ تمہارے کام اور تمہاری محنت پر منحصر ہے دوست کہتا ہے۔ دو بجے تک کام کرنا ہو گا — خیر دو کیا، میں تمام رات کام کرنے کو تیار ہوں، تنخواہ تو ملے گی۔

۲۲۔ستمبر ——————

پندرہ دن سے اخبار میں کام کر رہا ہوں۔ رات سات بجے جاتا ہوں اور ڈھائی تین بجے آتا ہوں۔ چیف ایڈیٹر صاحب مجھ پر بہت خوش ہیں اور کہتے ہیں تمہاری تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے گا۔

شام کو نسیمہ کا خط ملا۔ جی میں آیا کہ اسے پھاڑ ڈالوں یا کہیں پھینک دُوں، مگر دل پر اختیار نہیں — دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔ خط میں یہ مختصر عبارت تھی:-

ماموں جی کے خط سے معلوم ہوا کہ تم اخبار کے دفتر میں ملازم ہو گئے ہو

خدا کا شکر ہے اور لاکھ لاکھ شکر ہے۔ امید ہے تم بہت جلد ترقی کرو گے۔ اخبار
میرے نام بھیجا کرو، تمہارے مضامین پڑھنے کی بڑی خواہش ہے۔
اور کیا لکھوں اور لکھ بھی کیا سکتی ہوں۔ خداوند تعالےٰ تمہیں تمہاری
محنت کا پھل دے اور تم دُنیا میں بہت بہت ترقی کرو ——— یہی میری
انتہائی آرزو ہے۔

نسیمہ

۱۴۔ اکتوبر ——————!

شدتِ غم نے مجھے فلسفی بنا دیا ہے اور میں اب کائنات اور زندگی کے
عقدہائے لاینحل پر پہروں غور کرتا رہتا ہوں۔ اس شغل میں مجھے ایک قسم کا اطمینان
حاصل ہو رہا ہے۔ پہلے زندگی کی مصیبتوں سے گھبرا کر، اور پیہم ناکامیوں کی
تلخیوں سے بیزار ہو کر گھر سے باہر نکل جاتا تھا۔ سڑکوں، بازاروں اور باغوں میں
گھومتا رہتا تھا۔ مگر اب یہ حالت نہیں۔ رات کو کھانا کھا کر دفتر چلا جاتا ہوں۔
وہاں اس انہماک سے کام کرتا ہوں کہ دوسرے ایڈیٹر بھی اپنا کام میرے سپرد
کر دیتے ہیں۔ وہاں سے دو اڑھائی بجے کے قریب چھٹی ملتی ہے۔ اس وقت
کبھی اکیلا لارنس گارڈن میں چلا جاتا ہوں اور کبھی اپنے کسی ایڈیٹر دوست

کے ساتھ منٹو پارک میں نکل جاتا ہوں۔ خوب سیر ہوتی ہے۔ گھر آکر ایک بجے تک سویا رہتا ہوں۔ پھر غسل کر کے اور کھانا کھا کر مطالعے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ عشقیہ افسانے پڑھنے کو دل تو بہت چاہتا ہے مگر پڑھتا نہیں ـــ جب کسی صفحے پر محبت کا ذکر دیکھتا ہوں، دل کی خاکستر پھر شعلہ زن ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہی سوچا ہے کہ ادھر توجہ ہی نہ دی جائے۔ آخر سینے کے زخموں کو چھیڑنے سے مطلب؟

۲۶۔ اکتوبر ـــــــــــــــ!

فلسفہ، فلسفہ، رات دن فلسفہ، بیسیوں ضخیم کتابیں پڑھ ڈالیں، مگر دل کو اطمینان نصیب نہیں۔

فلسفی جو کچھ کہتا ہے وہ یقیناً درست ہوگا، مگر اس کا کیا علاج کہ اس کی موشگافیاں میرے دل کو اطمینان دینے کی بجائے میرے اضطراب میں اضافہ کر رہی ہیں ـــ میری بے قراری کی آگ پر تیل ڈال رہی ہیں، میرے زخموں پر پھاہا رکھنے کی بجائے نشتر لگا رہی ہیں۔

فلسفہ ـــ کچھ بھی نہیں ہے فلسفہ ـــ اور اگر کچھ ہے تو ان لوگوں کے لئے جن کے دل پہلے ہی مطمئن ہیں۔ بدقسمت اور بے قرار ہستیوں کے لئے فلسفے میں آگ بھری ہوئی ہے۔

رات نسیمہ بہت یاد آئی ــــــ رونے کو جی چاہا مگر آنسو ضبط کر لیے کہ کہیں
ماں ان آنسوؤں کو دیکھ نہ لے ــــــ وُہ سمجھتی ہیں میری حالت درست ہو گئی ہے۔
آہ! انہیں کیا معلوم کہ ان کے بیٹے کے دِل پر کیا کچھ گزر رہی ہے ــــــ لوگ پانی کو
خاموش دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ سمندر بالکل ساکن ہے حالانکہ سمندر کی گہرائیوں میں
ایسے طوفان اور ایسے تلاطم برپا ہوتے ہیں کہ اگر وُہ سطح پر آجائیں تو تمام شہر چند
لمحوں ہی میں بہ جائے مگر دُنیا ــــــ آہ دُنیا کو اس کی کیا خبر؟

۱۱- نومبر ــــــــــــــــــــ !

پھر وُہی وحشت، پھر وُہی دماغی انتشار ــــــ زندگی اور کائنات پر غور کرنے
کی کوشش کرتا ہوں مگر ہر طرف تلخی ہی تلخی، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آنے لگتی ہے۔ یہ
دیکھ کر دِل بے قرار و پریشان ہو جاتا ہے۔ بچپن میں ایک نظم پڑھی تھی، جس میں شاعر
صاحب نے دُنیا کی رنگینیوں اور رعنائیوں کا ذکر کر کے دُنیا کو جنت بنایا تھا، اور سچ
تو یہ ہے کہ اُس وقت میں بھی دُنیا کو جنت سمجھتا تھا، مگر آج کوئی دُنیا کی حقیقت میرے
دِل سے پوچھے۔

آج اگر ایک طرف دُنیا ہو اور دوسری طرف جہنّم اور مجھ سے کہا جائے کہ
رہنے کے لئے اِن دونوں میں سے کوئی مقام پسند کر لو تو میں ایک لمحہ بھی ہچکچائے

بغیر جہنم میں جانا پسند کر لوں گا ——— مجھے اِس ظالم دُنیا سے نفرت ہے ——— شدید نفرت!

۲۱-نومبر ———————— !

یہ کیا سوسائٹی ہے؟ یہ کیا مذہب ہے؟ ——— دھوکا ——— ہر چیز میں دھوکا ہر طرف دھوکا۔ لوگ کہتے ہیں، چور رات کی تاریکیوں میں مال و دولت چرا لے جاتے ہیں اور کسی کو خبر نہیں ہوتی ——— مگر میں دیکھتا ہوں سوسائٹی اور مذہب دن کے اُجالے میں، سب کی نگاہوں کے سامنے انسانیت پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں اور کسی میں اتنی جُراُت نہیں کہ حقیقت کا اظہار کر سکے ——— ہم بُزدل انسان سوسائٹی کو پُوجتے ہیں اور اس کے ہر فرمان کی تعمیل اپنا فرض سمجھتے ہیں، مذہب کی پرستش کرتے ہیں اور اس کے کسی حکم کے آگے چون و چرا نہیں کرتے۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ ——— یا تو میں پاگل ہو گیا ہوں، میرا دماغ خراب ہو گیا ہے، یا میں نے دُنیا کو اب سمجھا ہے۔

مزدور دن رات محنت کرتا ہے۔ اور جو کچھ کماتا ہے، وہ کاہل سرمایہ دار کی جیبوں میں چلا جاتا ہے اور اس جانگداز محنت کے عوض اس بے چارے کو اتنا بھی نہیں مِلتا کہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکے۔ مگر سوسائٹی کا قانون

سرمایہ داری کی پیٹھ ٹھونکتا ہے اور ہم پورے زور کے ساتھ — پھیپھڑوں کی تمام طاقت کے ساتھ پکار اُٹھتے ہیں :-

"سوسائٹی ہر انسان کے حقوق کی حفاظت کر رہی ہے" زندہ باد سوسائٹی" !

جاہل لوگ اپنے سے بھی بڑھ کر جاہل پیروں کے سامنے سجدے کرتے ہیں اور اپنا سب کچھ ان کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور ہم فرطِ مسرت میں جھوم جھوم کر نعرے لگاتے ہیں :- "یہی حقیقی مذہب ہے — یہی حقیقی مذہب ہونا چاہیئے" !

بار بار دل سے سوال کرتا ہوں ، کیا یہی ہماری قابلِ احترام سوسائٹی ہے۔ کیا ہماری قابلِ احترام سوسائٹی کو اسی طرح انسانیت کی حفاظت کرنی چاہیئے ؟ کیا یہی نیکیوں کی تعلیم دینے والا ہمارا مقدس مذہب ہے ؟ کیا ہمارے مقدس مذہب کو اسی طرح نیکیوں کی تعلیم دینی چاہیئے ؟

۱۵ دسمبر ——————— !

ابھی ابھی میں نے ایک نہایت دہشت ناک خواب دیکھا ہے — جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ تمام وکمال تو بیان نہیں کر سکتا ، البتہ جو کچھ تھوڑا بہت ذہن میں محفوظ ہے اسے الفاظ میں بیان کر دیتا ہوں۔

میں نے دیکھا کہ ایک کشادہ اور بارونق بازار میں سے گزر رہا ہوں۔ دونوں

طرف شاندار دکانیں برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنی ہوئی ہیں۔ لوگ بڑی دلچسپی کے ساتھ خرید و فروخت میں مصروف ہیں، موٹر کاریں اور ٹانگے اِدھر سے اُدھر، اور اُدھر سے اِدھر جا رہے ہیں اور آ رہے ہیں۔ میں ایک عالیشان مندر دیکھتا ہوں جسکی ایک سیڑھی پر ایک اپاہج عورت جس کے ننگے شانے کے زخم سے پیپ بہ رہی ہے اپنے نحیف و نزار بچے کو گود میں لئے ہر اُس شخص سے بھیک مانگتی ہے جو مندر میں جانے کے لئے سیڑھی پر قدم رکھتا ہے۔ لوگ اس کے کراہت انگیز زخم کو دیکھ کر جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہیں اور مندر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اتنے میں مندر کا پجاری آتا ہے اور فقیرنی کو گالیاں دیتے ہوئے سیڑھی سے اُٹھا دیتا ہے۔ فقیرنی سیڑھی سے نیچے اُترتی ہے اور بچے کو پیٹھ پر بٹھا کر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل بڑی مشکل کے ساتھ آگے بڑھنے لگتی ہے۔

آگے چل کر دیکھتا ہوں کہ ایک مسجد کے دروازے پر ایک بوڑھا آدمی کھڑا ہے اور دروازے کو کھٹکھٹا رہا ہے۔ مولوی صاحب، جن کی سفید نورانی داڑھی ان کے سینے پر چھائی ہوئی ہے تشریف لاتے ہیں اور گرج کر پوچھتے ہیں:۔

"کیا ہے؟"

"مولوی جی ــــ مسافر ــــ اندر سو لینے دیں"۔

"یہ مسجد ہے سرائے نہیں ہے"۔

یہ کہہ کر مولوی صاحب زور سے دروازہ بند کر لیتے ہیں۔ مسافر سیڑھی سے اُتر کر سردی سے ٹھٹھرتا ہوا، مایوسی کے عالم میں گردن جھکا کر چلنے لگتا ہے ــــ!

آگے چل کر دیکھتا ہوں کہ ایک ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ایک موٹر آکر ٹھہرتی ہے۔ موٹر میں سے دو موٹے موٹے جامہ زیب آدمی نکلتے ہیں، اور ہوٹل کی طرف قدم اُٹھانے لگتے ہیں۔ دروازے پر پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں، اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگتے ہیں۔ ڈرائیور موٹر میں سے ایک سہمی ہوئی، ڈرتی ہوئی، پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس لڑکی کو نکالتا ہے اور اسے ہوٹل کی طرف لے جانے لگتا ہے، لڑکی قدم قدم پر رُکتی ہے، مایوسی سے آسمان کی طرف دیکھتی ہے اور لمبی آہ بھرتی ہے یہاں تک کہ وُہ دروازے پر پہنچ جاتی ہے۔ چاروں اندر چلے جاتے ہیں۔

ایک طرف دیکھتا ہوں کہ ایک دُبلا پتلا آدمی بار بار اپنا ہاتھ ایک دولتمند آدمی کے بوٹ پر رکھ دیتا ہے، مگر دولت مند آدمی ہر بار اس کے ہاتھ کو ٹھکرا دیتا ہے۔

غریب آدمی کہہ رہا ہے ۔"اب معاف کردو سرکار! اللہ کی قسم، آئندہ مر جاؤں پھر بھی "چھٹی" نہ لوں ۔ معاف کردو سرکار! میرے بیوی بچے "بھوکے ہیں"۔

دولتمند آدمی گرج کر کہتا ہے ۔"دور ہوتے ہو یا نہیں"۔ یہ کہکر اپنی کوٹھی میں چلا جاتا ہے۔ غریب آدمی چپ چاپ آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اُسکی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔

ایک طرف پولیس کے سپاہی دو شخصوں کو، جن میں ایک لڑکا ہے اور دوسرا مُسن ہتھکڑی لگائے کسی طرف لئے جا رہے ہیں، ان کے پیچھے پیچھے دو عورتیں ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگ رہی ہیں۔ جیسے ہی وہ ان کے قریب پہنچتی ہیں، سپاہی ان کو فحش گالیاں دیتے ہیں۔ وہ رک جاتی ہیں۔ اور جب وہ ذرا آگے بڑھ جاتے ہیں یہ پھر بھاگنے لگتی ہیں۔

بازار کے ایک سرے پر ایک جنٹلمین تیزی سے قدم اٹھا رہا ہے، اسکے پیچھے ایک بوڑھا مزدور بھاری بوجھ سر پر اٹھائے چل رہا ہے۔ جنٹلمین مزدور کو بار بار تیز چلنے کے لئے کہتا ہے اور گالی دیتا ہے۔ مزدور پسینے میں شرابور ہے پھر بھی وہ جلدی جلدی قدم اٹھا رہا ہے۔ ایک جگہ پہنچ کر جنٹلمین کے کہنے

پر مزدور اسباب اتار دیتا ہے۔ جنٹلمین جیب سے ایک آنہ نکال کر اس کی طرف پھینک دیتا ہے۔ مزدور رُک رُک کر کہتا ہے۔" بابو جی ـــــ اتنی ـــــ تھوڑی مزدوری ....."

جنٹلمین اُسے فحش گالی دے کر اسباب کا جائزہ لینے لگتا ہے۔

ایک طرف ایک زرگر کی دکان پر ایک عورت بیٹھی اپنے چاندی کے گہنے بیچ رہی ہے اور دکاندار نہایت بے پروائی سے سودا کر رہا ہے ـــ عورت دردناک آواز میں کہتی ہے :۔

" مَیں بھلا یہ گہنا کیوں بیچتی۔ میاں جی نے بڑے شوق سے بنوا کر دیا تھا مگر کیا کروں، لڑکے نے کل فیس دینی ہے۔"

دکاندار مغرورانہ انداز میں کہتا ہے۔

" مجھے اِس سے کیا ـــ ؟ میں تو بس اتنا ہی دے سکتا ہوں، لینا ہے تو لو ورنہ جاؤ اپنا کام کرو۔"

اتنے میں ایک طرف سے شور سنائی دیتا ہے ـ چند لمحوں کے بعد ایک موٹر آتی ہے۔ موٹر میں ایک آدمی بیٹھا ہے، پھولوں میں لدا ہوا۔ موٹر کے پیچھے بے شمار لوگ جلوس کی صورت میں چلے آرہے ہیں۔

میں یہ سب کچھ دیکھتا ہُوا آگے بڑھتا ہوں ــ شہر سے باہر نکل کر ایک پہاڑی پر چڑھ جاتا ہوں۔ اور اُس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر شہر پر نگاہ ڈالتا ہُوں۔ روشنی میں دکانیں جگمگا رہی ہیں، موٹریں اُڑی جا رہی ہیں، خرید و فروخت ہو رہی ہے۔

میں سوچتا ہُوں کس قدر روشنی پھیلی ہُوئی ہے ـــ مگر اس روشنی میں کتنی تاریکیاں لپٹی ہوئی ہیں۔ ایک طرف دولت کے انبار اور دُوسری طرف مسلسل فاقے، ایک جانب بلند مکانات اور ان کے سامنے سڑکوں پر سردی سے ٹھٹھرے ہوئے غریب انسان ـــ کارخانوں میں چیزیں تیار ہو رہی ہیں ـــ فیکٹریوں میں کام ہو رہا ہے ـــ کھیت بوئے جا رہے ہیں ـــ مگر ان کارخانوں میں ان فیکٹریوں میں اور ان کھیتوں پر جو مزدور کام کرتے ہیں، وُہ سوکھی روٹیوں کے لئے بھی محتاج ہیں ـــ

انہی خیالات میں غرق تھا کہ میں نے دیکھا آسمان کے مشرقی گوشے میں ایک ستارہ بڑی تیزی کے ساتھ گردش کر رہا ہے اور اُس کی رنگت خون کی طرح سُرخ ہو رہی ہے ـــ چند منٹ کے بعد یہ ستارہ فضا میں ہر طرف پھیل جاتا ہے ـــ اب میں جدھر نگاہ ڈالتا ہوں۔ اس کی بھیانک سرخی ہی نظر آتی ہے ـــ یکایک شور و غل سنائی دیتا ہے۔ میں پہاڑی سے نیچے اُتر

آتا ہوں۔ بازاروں میں لوگ ہراسان و پریشاں بھاگ رہے ہیں۔ فضا میں قیامت کا شور برپا ہے۔

اتنے میں دیکھتا ہوں کہ بے شمار لوگ جو پھٹے پُرانے کپڑوں میں ملبوس ہیں، اور جنہوں نے ہاتھوں میں لاٹھیاں، نیزے اور تیغے پکڑے ہوئے ہیں "بغاوت بغاوت" کا نعرہ لگاتے ہوئے ایک طوفانی طاقت کے ساتھ بھاگ رہے ہیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں 'بغاوت' برپا ہو گئی ہے اور یہ لوگ باغی ہیں۔

میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا ہوں، ایک جگہ دیکھتا ہوں کہ باغی ایک عظیم الشان عمارت کو گرا رہے ہیں ——— عمارت کے آگے بیسیوں خوش پوش آدمیوں کو پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہے۔ آواز آتی ہے کہ:۔

"بغاوت سے پہلے تم لوگ قانون ساز اور منصف تھے۔ لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے تمہارے قلم کی جنبشوں پر منحصر تھے۔ تمہارا فرض تھا کہ ہر شخص کے حقوق کی حفاظت کرتے ——— مگر تم نے ہمیشہ سرمایہ داری، ظلم اور جعلسازی کو فروغ دیا۔ تمہارے ذلیل قوانین نے مظلومیت کا ساتھ دینے کی بجائے ظلم کی ہمت افزائی کی تم نے انصاف کی کرسیوں پر بیٹھ کر دُنیا کی تمام بے انصافیاں کیں،

آج تمہارے ساتھ انصاف کیا جا رہا ہے اور یہ انصاف کرنے والے وہی لوگ ہیں، جن کو تم ذلیل، حقیر اور ادنےٰ درجے کے انسان سمجھتے تھے۔"

آگے چل کر دیکھتا ہوں کہ ایک اور شاندار عمارت کو گرایا جا رہا ہے آواز آتی ہے:۔

"یہ عمارت بغاوت سے پہلے دار العلوم تھا۔یہاں سے علم کے دریا بہائے جاتے تھے، مگر آج اس تعلیم اور اس تعلیمی ادارے کو حرفِ غلط کی طرح مٹایا جا رہا ہے۔غلامی کی تعلیم دینے والے —— اور انسانوں سے انسانیت چھیننے والے علم کو زندہ رکھنا انسانیت پر ظلم کرنا ہے۔"

آگے چل کر دیکھتا ہوں کہ نہایت محترم اور معزز ہستیوں کو آگ کے ایک بہت بڑے الاؤ میں گرایا جا رہا ہے۔آواز آتی ہے:۔

"تم مذہب کے پاسبان تھے۔تمہارا فرض تھا کہ لوگوں کو نیکیاں سکھاتے، مگر تم نے دنیاوی عیش و عشرت کے لئے مذہب کو ایک بہت بڑے دھوکے کا ذریعہ بنا لیا—— تم نے خدا کے ناکارہ بندوں کے ساتھ شرمناک سلوک کیا۔مندروں کی سیڑھیوں پر سے اپاہج ہستیوں کو ٹھوکریں مار کر گرا دیا—— مسجدوں کے دروازے سردی سے ٹھٹھرے ہوئے مسافروں پر بند کر دیئے جاہل انسانوں

کے دِل و دماغ میں تعصّب کا زہر پھیلایا، اَور ایک ہی ملک کے باشندوں کو آپس میں لڑاتے رہے۔"

اِن کے قریب ہی ایک اَور معزّز جماعت کو آگ کے انگاروں پر دَوڑایا جا رہا ہے۔ آواز آتی ہے:۔

" تم لوگ لیڈر تھے، مگر تم نے ذاتی فائدے کے لئے اَن پڑھ پبلک کو طرح طرح کے دھوکے دیئے۔ ایک فرقے کو دوسرے فرقے کے خلاف اُبھارا، ایک جماعت کو دوسری جماعت سے لڑایا ——— اَور ایک قوم سے دوسری قوم کے سر قلم کروائے۔"

آگے جا کر دیکھتا ہُوں کہ بڑے بڑے موٹے آدمی بھاری بھاری پتھّر اُٹھائے بھاگ رہے ہیں اور جہاں ذرا قدم رُکتے ہیں، باغی ان کے جسم بید کی ضربوں سے لہو لہان کر دیتے ہیں۔ آواز آتی ہے:۔

" تم لوگ مہاجن اَور سرمایہ دار تھے۔ تم نے غریب مزدوروں کی شبانہ روز کی محنت سے فائدہ اُٹھا کر اپنے گھروں میں دولت کے انبار لگا لئے ——— مگر ان غریب مزدوروں کو اتنا بھی نہ دیا کہ یہ بیچارے پیٹ بھر کر روٹی ہی کھا سکیں۔ اب اس بغاوت کے بعد انسانی مساوات قائم ہو گی۔ کوئی سرمایہ دار نہیں

ہوگا، کوئی مزدور نظر نہیں آئیگا۔"

پھر دیکھتا ہوں کہ ایک گوشے میں زخمی لوگوں کے زخموں پر تپتے ہوئے نشتر چبھوئے جا رہے ہیں۔ آواز آتی ہے :-

"تم نے غریب معصوم عورتوں کو اپنی ہوس کا شکار بنایا، آج اپنے کئے کی سزا بھگتو۔"

ایک سزا کا منظر دیکھتے ہی میرا رُواں رُواں کانپ اُٹھا۔ دیکھتا ہوں کہ باغی تختوں سے بندھے ہوئے لوگوں کی آنکھوں، کانوں اور گردنوں میں لوہے کے کیل گاڑ رہے ہیں ـــ آواز آتی ہے :-

"مُلک سے غدّاری کرنے والا انسان دنیا کا ذلیل ترین انسان ہے اور دُنیا کی کوئی سزا بھی اس کے لئے کافی نہیں!"

مجھ میں آگے چلنے کی سکت نہیں رہتی ـــ میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا ہوں ـــ یکایک فضا میں ٹن ٹن کی آواز گونجتی ہے ـــ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھُل جاتی ہے۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا ہوں، ہمسائے کے گھر میں کلاک بارہ بجا رہا تھا۔

۲۲-جنوری ——————— !

چار مہینوں سے اخبار میں کام کر رہا ہوں، مگر ابھی تک صرف ساڑھے تئیس روپے ملے ہیں اور وُہ بھی دو دو تین تین کر کے ——— اس اخبار کے پروپرائیٹر صاحب اخبار کے کالموں میں کئی دفعہ سوشلزم کی تائید میں پُرزور مقالات تحریر فرما چکے ہیں، کئی دفعہ جلسوں میں مزدوروں کی تحریکوں کے متعلق آتشیں تقریریں کر چکے ہیں اور متعدد بار سرمایہ داروں کے مظالم کی خونین داستان بیان کر چکے ہیں۔ دُنیا انہیں ایک بہت بڑا مخلص لیڈر سمجھتی ہے اور ان کے اخبار کا مطالعہ عین ثواب ——— مگر ان کا مزدوروں کے ساتھ اپنا برتاؤ کیا ہے؛

سمجھ میں نہیں آتا، یہ گندم نما جو فروش لیڈر کس طرح ضمیر کو کچل کر پبلک کو دھوکا دیتا ہے، اور حیران ہوں، کہ پبلک کیوں اس کے دھوکے کے جال میں گرفتار ہے؛

۲۷-جنوری ——————— !

اب میں ایک اور اخبار میں کام کر رہا ہوں، یہاں اتنی محنت تو نہیں کرنی پڑتی، مگر رات کی ڈیوٹی آخر رات کی ڈیوٹی ہے۔ میری صحت گر چکی ہے، سینے میں ہر وقت ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ اور جب کچھ دیر تک لکھنا رہتا ہوں تو سر

چکرانے لگتا ہے۔ زکام تو ایک لمحے کے لئے بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ آنکھوں کا یہ حال ہے کہ جب کسی چیز کی طرف چند سیکنڈ کے لئے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہوں تو ان سے پانی بہنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی کھانسی اس شدت سے آتی ہے کہ سانس رُک جاتا ہے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ کل "شیو" کرتے وقت آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور ان کے گرد سیاہ حلقے، رخساروں کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی۔ رنگ بالکل سیاہ۔

اپنا بھیانک چہرہ دیکھ کر طبیعت بیزار ہو گئی، اور تمام دن بیزار رہی۔

۱۴- فروری

بخار میں مبتلا ہوں، بدن میں آگ سی لگی ہے۔ رات دن بڑے بڑے بدبو دار دواؤں کے پیالے پینے پڑتے ہیں۔ امّی کہتی ہیں۔ "بیٹا! خدا تجھے جلد صحت دے۔ تیرے رشتے کی بات چیت ہو رہی ہے۔ وہ لوگ تجھے دیکھنا چاہتے ہیں" بہنیں کہتی ہیں۔ "بھائی جان! آپ بستر سے اُٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل ہوں تو ہم فوراً بھابی کو لے آئیں۔"

ان کی باتیں سُن سُن کر سینے میں سوراخ ہو گئے ہیں۔

۱۸- فروری ـــــــــــــــــــ!

کھانسی دم لینے نہیں دیتی ـــ رات قے کے ساتھ خون آیا، امّی پاس نہ تھیں۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر خون آلود قے کے اوپر راکھ ڈال دی تاکہ اس کے اوپر ماں کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ امّی اپنی ایک ہمسائی کے ساتھ بہنوں کی قمیضوں اور شلواروں کے لئے کپڑا خریدنے کے لئے باہر گئی ہوئی تھیں ـــ اصغری کہہ رہی تھی ـــ "بھائی جان! آپ کی ساس کل پرسوں آنے والی ہے ـــ آپ کو دیکھنے کے لئے۔"

ساس مجھے دیکھنے کے لئے آئیگی؟ ـــ مجھے دیکھ کر کیا کریگی؟ ـــ ایک کھانستے ہوئے، حرکت کرتے ہوئے لاشے کو دیکھ کر کیا کرے گی؟ وُہ آ رہی ہے میرا مذاق اُڑانے کے لئے ـــ میرے آخری لمحوں کو تلخ کرنے کے لئے ـــ مجھے دیکھ کر چین بجبیں ہونے کے لئے ـــ ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ اب ایسی باتیں نہ کرو، کھیل ختم ہونے والا ہے، میں چار دن کا مہمان ہوں، کھڑکھڑاتی ہوئی ہڈیوں اور سیاہ گوشت کے سوا اور مجھ میں ہے کیا، پھر میری شادی کی باتیں ـــ رونے کی بجائے ہنسنے کی تیاریاں ـــ مگر یہ لوگ بھی مجبور ہیں، میں انہیں سانس لیتا ہوا نظر آ رہا ہوں۔

رات نسیمہ نے بہت رُلایا۔ لحاف میں مُنہ چھپا کر چپکے چپکے آنسو بہاتا رہا۔

ماں سمجھتی رہی کہ میں سو رہا ہوں — بڑے آرام سے سو رہا ہوں — دل میں بڑی حسرت ہے کہ ایک بار — آخری بار نسیمہ کو دیکھ لوں !

۲۵-فروری ——————— !

کئی بار خون کی قے کر چکا ہوں۔ خون کے ساتھ گوشت کے لوتھڑے بھی آنے شروع ہو گئے ہیں۔ بدنصیب زندگی گھُل گھُل کر اب آخری منزل پر پہنچ گئی ہے نہ معلوم کتنی گھڑیاں ابھی باقی ہیں۔

نسیمہ نہیں آئی — میں نے خط بھی لکھ دیا تھا، مگر اب اسے خط کہاں ملا ہوگا وُہ دوسرے گھر میں ہوگی۔

۲۶-فروری ——————— !

رات امی سے کہا — "امی پیاری ! میں اب جا رہا ہوں — مجھے معاف کر دو امی جان ! — میری امّی !"

وُہ رونے لگیں۔ میں نے کہا۔ "اماں جی ! میں نے آپ کو معاف کرنے کیلئے کہا ہے، رونے کے لئے تو نہیں کہا۔"

امی بولیں، "بیٹا مجھے دھوکا نہ دینا — تمہارے ہی دم سے زندہ ہوں۔"

اماں زار و قطار رونے لگیں۔ اور اُن کی دیکھا دیکھی بہنیں بھی سسکیاں

بھرنے لگیں۔ آہ! میں کیا کروں، ماں کہتی ہے دھوکا نہ دینا — دھوکا!
اب ہاتھوں میں سکت نہیں رہی — کچھ نظر نہیں آتا — شاید یہ میری
زندگی کی آخری رات ہے۔

× × × × × × × × × × × × × × × ×

چند سانس باقی رہ گئے ہیں۔
الوداع — میری پیاری امّی! — میری پیاری بہنو! — پیاری
نسیمہ! الوداع!
تاریکی کے سائے اردگرد ناچ رہے ہیں — الوداع!

شہاب

۳-فروری ______________ !

آدھی رات تک تو عالم بیتابی میں بستر پر کروٹیں لیتا رہا، اور اس دوران میں اپنی رُوٹھی ہوئی نیند کو منانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی، مگر معلوم ہوتا ہے آج تمام رات مَیں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوسکوں گا۔ اس لئے دوسرے کمرے میں آکر اپنا دیرینہ شوق پورا کرتے ہوئے ڈائری میں یہ سطریں گھسیٹ رہا ہوں، ڈائری لکھنا جی بہلانے کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہے اور میرے لئے تو ایک نعمتِ غیر مترقبہ! میں نے بارہا اس شغل سے اپنی پریشانیاں دُور کی ہیں اور اب بھی کہ میرا قلم سفید کاغذ پر حرکت کر رہا ہے، میرا دل پہلے کی طرح بیتاب نہیں ہے۔ مجھے کُرسی پر بیٹھے قریباً نصف گھنٹہ گزر چکا ہے۔ اور اس مختصر عرصے میں

امّی جان دو مرتبہ آکر مجھے سو جانے کی تاکید کر چکی ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ آنکھوں میں نیند آتی ہی نہیں۔ جب سے "فرحت آباد" جانے کا مژدۂ جانفزا سنا ہے، ایک میٹھی میٹھی بے چینی دل پر طاری ہے اور اس وقت دل کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ بقیہ وقت بھی جلد گزر جائے اور میں "فرحت آباد" کو روانہ ہو جاؤں۔

"فرحت آباد" میں میرے رشتے کے ماموں رہتے ہیں جو ایک کالج میں "انگلش ڈیپارٹمنٹ" کے ہیڈ ہیں۔ پہلے ان کے ساتھ کوئی راہ و رسم نہیں تھی لیکن گزشتہ موسم گرما میں جب ابا جان نے گھر آکر بتایا کہ آج دوپہر کے وقت میں نے شیخ سعید اللہ کو الفنسٹن ہوٹل میں جاتے ہوئے دیکھا ہے تو امی جان مُصر ہو گئیں کہ فوراً جائیے اور انہیں گھر لے کر آیئے!

اسی وقت ابا جی مجھے ساتھ لے کر الفنسٹن ہوٹل میں پہنچے۔ ماموں جان بڑے تپاک سے ملے۔ دُوسرے دن وُہ حسبِ وعدہ ہمارے گھر آئے۔ رات کے گیارہ بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔ اور میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ ماموں جی سے بڑھ کر شاید ہی کوئی دلچسپ الِلسان ہو۔ چُونکہ وُہ جس کام کے لئے لاہور تشریف لائے تھے، وُہ پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا اور دوسرے انہوں نے کالج بھی جانا تھا، اس لئے وہ جلد روانہ ہو گئے اور جاتے ہوئے ہم سے وعدہ لے گئے کہ ہم لوگ چند دن کے بعد

اُن کے یہاں ضرور پہنچیں گے۔ مگر یہ وعدہ گوناگوں وجوہ کی بنا پر مکمل ایک سال تک ایفا نہ ہو سکا۔ آج صبح کو جب میں گھر پہنچا تو امّی جان نے فرمایا :-

" تمہارے ماموں جان نے تار بھیجا ہے "۔

" کیا لکھا ہے اِسمیں ــــ بُلایا ہو گا مجھے "!

" نہیں، اُنہوں نے تو صرف یہ پوچھا ہے کہ اب تمہاری صحت کیسی ہے تم نے اپنے خط میں لکھا تھا نا، کہ قدرے علیل رہتا ہوں "۔

" وُہ تار کہاں ہے "۔

امّی جان مسکرانے لگیں، اتنے میں ابّا جی بھی آ گئے۔ امّی نے تار اُن کے حوالے کر دیا۔ تار پڑھ کر ابّا جی فرمانے لگے۔ " بھئی میں تو جا نہیں سکتا، دفتر میں کام بہت ہے چند دن تک انتظار کر لو دونوں چلیں گے "۔

لیکن میرے لئے انتظار سے بڑھ کر اور کوئی چیز سوہانِ رُوح نہیں۔ ابا جی میری اس عادت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس لئے وُہ کہنے لگے۔ " میرا مطلب یہ تو نہیں کہ تم بھی میرے ساتھ انتظار کرو۔ بیشک کل روانہ ہو جاؤ۔ میں چند دن ٹھہر کر تمھاری امّی کے ساتھ وہاں آ جاؤں گا۔ تم صرف ملازمت کے لئے کوشش کر رہے ہو اور کوئی مصروفیت نہیں۔ چند دن وہاں ٹھہرنا "!

"چند دن، وہ کیوں؟"

"چند دِن نہیں تو کیا چند سال؟ تم بے حد حساس واقع ہوئے ہو، بات بات پر رُوٹھ جاتے ہو۔ کیا ان لوگوں کو بھی ستانے کا ارادہ ہے؟" امی جان بولیں میں کرسی سے اُٹھا، مگر ابا جان بولے "خفا کیوں ہو گئے بیٹا! تمہاری ماں کو تو جھوٹ بولنے کی عادت سی ہو گئی ہے ـــــ اسی وقت "تار" بھیج دو کہ میں چار فروری کو شام کے چار بجے آپ کے یہاں پہنچ رہا ہوں۔ وہ تمہیں لینے کیلئے سٹیشن پر آجائیں گے۔"

میں خوشی خوشی اُٹھا اور ماموں جان کو تار دے دیا۔

ماموں جان نے اپنے ہر خط میں لکھا ہے کہ "یہاں کی فضا بہت دلآویز ہے کوٹھی سے کچھ دور ایک ندّی بہتی ہے" اور اس شہر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں گرمی نہیں ستاتی، موسم معتدل رہتا ہے۔"

ماموں جان کے یہ الفاظ ہر وقت میری آتش شوق کو بھڑکاتے رہتے ہیں اب دیکھئے وہاں کیا کچھ دیکھنے میں آتا ہے۔

کاش! یہ بوجھل وقت جلد ختم ہو جائے!

۴-فروری!

آج شام کے چار بجے گاڑی فرحت آباد کے سٹیشن پر پہنچ گئی۔ میں قلی کو آواز دینے کے لئے ڈبّے سے نیچے اُتر رہا تھا کہ ماموں جان آ پہنچے اور آتے ہی اس گرمجوشی اور محبت کے ساتھ مصافحہ کیا کہ میری انگلیاں درد کرنے لگیں۔ میں انگلیوں کو دبانے لگا تو وُہ بولے۔ "بڑے نازک معلوم ہوتے ہو، یہ بیماری نہیں تو اور کیا ہے؟ —— اور ہاں بھئی! اپنی ممانی سے ناراض ہو جو سلام تک نہیں کیا؟"

میں نے سامنے دیکھا۔ ماموں جی سے چند قدم ہٹ کر ایک اُدھیڑ عمر کی عورت محبت و شفقت میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھک کر سلام کیا اور دل ہی دل میں شرمندہ ہونے لگا کہ میرے لئے دونوں سٹیشن پر آ موجود ہوئے۔ پھر اسباب اُٹھوا کر سٹیشن سے باہر آئے۔ ماموں جان کی کار کھڑی تھی ہم تینوں اس میں بیٹھ گئے اور پندرہ منٹ کے بعد ماموں جان کی شاندار کوٹھی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ ماموں اور ممانی کے علاوہ تین اور ہستیاں بھی نظر آئیں ایک تو ممانی جی کی سوتیلی بیوہ بہن، ایک خادمہ اور ایک خادم۔ ممانی جان ان سے تعارف کرانے کے بعد بولیں "یہاں ایک اور ہستی بھی رہتی ہے، جانتے ہو کیا ہے؟"

"بہن زہرا شاید" میں نے کہا۔

"شاید، وُہ کیوں؟ اس کی ایک عزیز سہیلی کی شادی ہے" میں بھی وہیں تھی مگر تمھاری آمد کی خبر سُن کر آ گئی۔ تمھاری بہن کل شام تک نہیں تو پرسوں شام تک ضرور آجائے گی۔ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ گھر ہی میں مطالعہ کر کے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اگلے سال میٹرک کا امتحان دے گی۔ تم تو ماشاء اللہ بی، اے بھی کر چکے ہو۔ خدا ترقی دے"!

اِس کے بعد مَیں نے کھانا کھایا۔ ایک آدھ گھنٹہ آرام کیا اور پھر کوٹھی کی سیر کرنے لگا۔ ہر ایک کمرہ کشادہ اور اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ ماموں جان کا ڈرائینگ رُوم تو ایک اعجوبہ ہے۔ قالینوں پر ایسے ایسے نقش و نگار ہیں کہ انسان گھنٹوں دیکھا کرے۔ دیواروں پر جا بجا دنیا کے مشہور مصوّروں کے شاہکار آویزاں ہیں۔ ایک دیوار پر چینی آرٹ کے نمونے ہیں تو دوسری دیوار پر ہندوستانی مصوّروں کے مصوّرانہ نقوش اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ دائیں دیوار مرحوم نقاشوں کے زندہ جاوید کارناموں سے مزین ہے تو بائیں دیوار زندہ استادانِ فن کے حیرت انگیز آرٹ کی حامل!

ڈرائینگ روم کے ساتھ ایک لائبریری ہے۔ جہاں چاروں طرف کتابیں ہی

کتابیں نظر آتی ہیں۔

زہرا نے بھی اپنا ڈرائینگ روم بڑی خوش اسلوبی سے سجایا ہوا ہے، کمرے کی ہر چیز سے نفاست اور شعریت ٹپک رہی ہے۔ میز پر ماموں جان کی ضخیم کتابیں رکھ چھوڑی ہیں اور اس سے مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والے پر اس کی علمیّت کا رعب پڑے۔ میرے لئے تین کمرے وقف کر دئے گئے ہیں، ایک تو خوابگاہ ہے، دوسرا مطالعہ کا کمرہ اور تیسرا غسل خانہ۔

جس وقت سے یہاں آیا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک جنت میں داخل ہو گیا ہوں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اتنا عرصہ کیوں ماموں جان سے تعلقات منقطع رہے۔

۶۔ فروری

عالمِ طفولیت میں جب میں حسین و جمیل وادیوں اور دُور دراز رومانی شہروں کے سحر انگیز قصے پڑھتا تھا تو میرے دل میں ایک عجیب ناقابلِ اظہار کیفیت چھا جاتی تھی۔ اس وقت میری آرزو یہ ہوتی تھی کہ کاش میں ان گلپوش وادیوں، ان رومان انگیز شہروں میں پہنچ کر تمام عمر سیر کرتا رہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت میں نے الف لیلہ ہزار داستان میں سندباد جہازی کے تحیّر زا واقعات پڑھے تو میرا دل اتنا بے چین ہوا کہ گھر سے نکل کر دیر تک منٹو پارک میں ٹہلتا رہا اور رات کو

خواب میں بھی عجیب عجیب جزیروں کی سیر کرتا رہا۔ مناظر پرستی میری فطرت کا جزو ہے
اور آج ماموں جان کی کوٹھی کے ارد گرد گھوما تو یقین ہو گیا کہ میری دیرینہ آرزو
پوری ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماموں جان کی کوٹھی خوبصورت ترین مقام پر
واقع ہے۔ خوش قسمتی سے ماموں اور ممانی دونوں کو پھولوں سے بڑی محبت ہے۔
چنانچہ انہوں نے کوٹھی کے آگے اور عقب میں دو نہایت دلکش باغات لگوائے ہوئے
ہیں۔ یہاں بیشمار گملے اور پودے رنگ برنگ کے پھول آغوش میں لئے قطار در
قطار کھڑے ہیں۔ عقبی باغ سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی ندی آہستہ آہستہ بہ
رہی ہے۔ اور ایک کھیت کے پاس جہاں ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار فضا کی رومانیت میں
خاص اضافہ کر رہی ہے، شاہ بلوط فضائے بسیط میں اپنا سر اٹھائے ایک پُر اسرار
عظمت کے ساتھ کھڑا ہے۔

آج ارد گرد گھومتا گھامتا اس درخت کے نیچے بنچ پر لیٹا، تو دل کو بہت
لطف حاصل ہوا۔ ماموں اور ممانی دونوں بڑی شفقت اور محبت سے پیش آ
رہے ہیں۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ کم از کم چھ ماہ یہاں رہونگا۔

ابھی تک زہرا نہیں آئی۔ امید ہے کل صبح آ جائے گی۔ ممانی جی نے نوکر
کو ادھر بھیجا ہے۔ اس کے آتے ہی دلچسپیوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ ممانی جان

کہتی ہیں، تمہاری بہن بیحد دلچسپ لڑکی ہے، دیکھئے کب آتی ہے، بیتابی کے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔

۷۔ فروری ____________ !

میں صبح کو، دیر تک سونے کا عادی ہوں، مگر آج چونکہ علی الصباح ماموں جان کیساتھ شکار پر جانا تھا۔ اسلئے نوکر نے میری ہدایت کے مطابق مجھے چھ بجے ہی بیدار کر دیا۔ میں نے غسل کیا اور لباس تبدیل کرنے کے بعد ان کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ وہ خود میری طرف آتے دکھائی دیئے ___ خیر، میں، ماموں جان اور نوکر ہم تینوں کار میں بیٹھ گئے اور کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ راستے میں پر لطف مناظر دیکھے۔ کبھی تو ہماری نگاہوں کے سامنے لق و دق میدان ہوتا تھا، کبھی سر سبز و شاداب باغ، کبھی ہماری کار پہاڑی راستے پر اڑی جاتی تھی تو کبھی تنگ اور ویران راہ پر۔ آخر منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔

ماموں جان نے پہلی کوشش ہی میں ایک ہرن حاصل کر لیا۔ اس کے بعد کئی گھنٹے گزر گئے اور کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ ایک بجے کے قریب صرف چند منٹ میں تین ہرن مل گئے۔ یہ کافی کامیابی تھی۔ ہم نے شکار موٹر میں رکھا اور کوٹھی کی راہ لی۔ کوٹھی پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ زہرا آگئی ہے۔ میرا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ میں جھٹ

ڈرائنگ رُوم میں گیا، وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد زہرا کے مطالعے کے کمرے میں گیا، وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ مَیں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے چند منٹ گزرے ہونگے، کہ نوکر ایک لفافہ لے کر آیا۔ لفافے کے اوپر میرا نام لکھا تھا۔ میں نے اسے کھولا، اندر کاغذ کے ایک پُرزے پر لکھا تھا:۔

"چوروں کی طرح دوسروں کے کمرے میں آنا اچھی بات نہیں ——

—— ایسا کرنے سے بعض اوقات نقصان ہوتا ہے۔"

اِس سطر کے نیچے لکھا تھا:۔ "راقمہ —— اس کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے والی"۔

میں ہنسنے لگا۔

"اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے بھلا؟" ایک لطیف آواز میرے کان میں آئی مَیں نے پلٹ کر دیکھا، دروازے پر تیرہ چودہ سال کی ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی کھڑی تھی۔

"اچھّا آپ ہیں زہرا صاحبہ!" مَیں نے پوچھا

"جی —— اور یہ میرا مطالعہ کا کمرہ ہے۔"

"میرا یہاں آنا آپ کو بُرا لگا؟"

"جی ہاں!"

"تو مَیں کمرے سے نکل جاتا ہوں۔"

"شرافت کا تقاضا تو یہی ہے۔" وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر رومال کاڑھنے لگی اور
میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ جاتے کیوں نہیں؟" اُس نے مسکرا کر پوچھا!

مَیں اُٹھا، دروازے تک آیا۔ خیال تھا وہ بُلا لے گی، لیکن وہ نگاہیں جھکائے
برابر اپنے کام میں مشغول رہی۔ میں دروازے سے باہر نکل آیا۔ راہ میں ممانی جی نے
پوچھا۔ "کیوں زہرا سے ملے؟"

مَیں نے کہا۔ "جی ہاں، بڑی ذہین اور فطین لڑکی ہے۔" یہ کہہ کر جلدی جلدی
قدم اُٹھائے اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ ممانی جی ضرور میری اس روش پر حیران ہونگی
اور مَیں ان کی صاحبزادی کی روش پر متعجب ہُوں۔

۸۔ فروری!

صبح کو ناشتہ کر کے میں ماموں جان کے ڈرائینگ روم میں گیا تو دیکھا زہرا
بھی وہیں ایک صوفے پر بیٹھی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی
اور بلند آواز سے کتاب پڑھنے لگی۔

مَیں نے الماری میں سے بائرن کی نظموں کا مجموعہ نکالا اور شیلے کا کلام ڈھونڈنے

لگا۔ اتنے میں فیروز زہرا کے لئے ناشتہ لے کر آگیا۔ زہرا اسے دیکھتے ہی غصّہ سے کہنے لگی۔

"چوروں کی طرح کمرے میں آجاتے ہو، یہ بات ٹھیک نہیں اور دوسروں کی چیزوں کو ہاتھ لگانا بھی نہیں چاہیئے۔"

یہ الفاظ نوکر سے مخاطب ہو کر مجھے سنائے گئے تھے۔ اس کی نگاہیں بظاہر نوکر پہ جمی تھیں، لیکن وہ کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے دونوں کتابیں اس کے پاس صوفے پر پھینک دیں اور اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔

یکایک خیال آیا ماموں جان نے کل شکار پر کہا تھا، ندّی کے پار ایک پرانا مندر ہے۔ کبھی سیر کرتے کرتے وہاں بھی چلے جانا۔ میں فوراً اٹھا اور اس طرف روانہ ہو گیا۔ ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مندر نظر آیا۔ واقعی بہت عجیب عمارت ہے۔ چاروں طرف بلند درخت کھڑے ہیں۔ اندر جانے کیلئے ایک چھوٹا سا دروازہ ہے، کیونکہ بڑا دروازہ دیوار گر جانے سے منہدم ہو چکا ہے۔ کافی دیر تک اس کھنڈر کی سیر کی، پھر کوٹھی پہنچا۔ ڈیڑھ بج چکا تھا، ممانی جان دیکھتے ہی بولیں

"کہاں غائب ہو گئے تھے تم ــــ فیروز تمہیں دو مرتبہ بلانے کے لئے گیا تم کہیں بھی نہیں تھے۔"

میں نے بتایا کہ پرانا مندر دیکھنے چلا گیا تھا۔

"مندر دیکھنے کا اتنا شوق تھا تو کھانا کھا کر گئے ہوتے۔ صبح تم نے زہرا کا امتحان لیا تھا؟"

"بہت لائق لڑکی ہے۔"

"ہوں — ناراض ہو اس سے؟ — کوئی شرارت تو نہیں کی اس نے؟ وہ شروع شروع میں اپنے ہر مہمان سے یہی سلوک کیا کرتی ہے، لیکن بعد میں بڑی عزّت کرتی ہے۔"

"ممانی جان! انہوں نے مجھے چور بنا دیا ہے۔ کہتی ہیں، چوروں کی طرح دوسروں کے کمرے میں نہ آیا جایا کرو۔"

"تو یہ ٹھیک نہیں — چوروں کی طرح دوسروں کے کمروں میں آنا درست ہے؟" زہرا نے جھٹ سامنے آکر کہا۔

"ہش پگلی! اپنے بھائی جان سے ایسی باتیں!"

"واہ امّی جان! — آپ نے بھی خوب سمجھا ہے۔ میں نے ان کی خدمت میں یہی عرض کی تھی کہ چوروں کی طرح نہ آیا کریں بلکہ شریفوں کی مانند —"

"اور شریف کس طرح آیا جایا کرتے ہیں؟"

"یہ بات تو ہر شریف آدمی جانتا ہے ــــ ہمارے بھائی جان نہیں جانتے"
ممانی جان ہنسنے لگیں۔ "خیر اب صلح کر لو!"
"مَیں تو نہیں کرتی ــــ یہ میری چٹکیاں کھاتے ہیں اور چٹکیاں کھانیوالا کون ہوتا ہے" یہ کہکر وُہ بھاگ گئی۔
"ابھی بچی ہے ــــ باپ پیار سے میری ننھی کہتا ہے' بُرا نہ منانا!"
"نہیں ممانی جان"
"مَیں اپنے کمرے میں چلا آیا۔
ابھی ابھی نوکر نے بتایا ہے "آپ کے اباجان کا خط شیخ صاحب کے نام آیا ہے، جس میں لکھا ہے کہ وُہ چند دن تک آرہے ہیں"

۱۱۔فروری ــــــــــــــــ!

میں صبح شاہ بلوط کے نیچے ٹہل رہا تھا۔ معاً خیال آیا، اباجی اور امی جان تشریف لے آئی ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں چٹان کے قریب پہنچا کہ وہاں سے اپنی کتاب اُٹھا کر کوٹھی کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ مگر وہاں کتاب نہیں تھی۔ بہتیرا ادھر اُدھر تلاش کیا، لیکن بیسود۔ اسی عالم پریشانی میں گھر پہنچا۔ اباجی اور امّی دونوں بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ امّی جان مجھے دیکھتے

ہی بولیں۔ یہاں آتے ہی ہمیں بھول گئے ۔۔ شاید ماموں جان نے تم پر جادو کر دیا ہے۔"

مَیں نے جواب دیا۔ "امّی جان، مجھے ہر لمحہ آپ کی آمد کا خیال تھا اور مَیں آنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ میری کتاب کہیں گم ہو گئی، اسے ڈھونڈ تا رہا۔"

"تو کیا کتاب ابھی تک نہیں ملی؟" زہرا نے کہا۔

مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا، شریر لڑکی میری کتاب سے اپنا چہرہ چھپا رہی تھی۔ مَیں نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا کہ مجھے چور کہتی تھی، اب ثابت ہو گیا کہ خود ہی چور ہے۔ وُہ قہقہہ لگا کر اندر بھاگ گئی۔

اِس کے بعد کئی گھنٹے باتیں ہوتی رہیں۔ اِس دوران میں ماموں جان نے کہہ دیا۔ "میری صلاح ہے کہ اِسے اپنے کالج میں پروفیسر کرا دوں۔ تنخواہ معقول ہوگی، بآسانی ایم اے کا امتحان پاس کرے گا۔"

یہ سن کر مَیں وفورِ مسرت سے اچھل پڑا۔ بچپن سے میری آرزو تھی کہ کسی کالج میں پروفیسر ہوں اور آج میری اس آرزو کے پورا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ والدین ملے تو نہایت شفیق اور مہربان جنہوں نے میری کسی آرزو کو آج تک نہیں ٹھکرایا، اور ماموں

ملا تو ماں باپ سے بھی زیادہ محبت کرنے والا۔۔۔ میں کیوں نہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کروں؟"

آج شام کو میں نے زہرا سے صبح کی شرارت کا بدلہ لے لیا ہے۔ وہ غسلخانے میں منہ ہاتھ دھو رہی تھی اور اس کی رسٹ واچ کرسی پر پڑی تھی۔ میں دبے پاؤں گیا اور اس کی گھڑی اٹھا کر لے آیا۔ زہرا کو جب کہیں بھی گھڑی دکھائی نہ دی تو وہ بہت سٹپٹائی۔ نوکروں کو ڈانٹا، مالن کی بیٹی پر جھوٹا الزام لگایا اور خدا جانے کیا کچھ کیا۔ میں بڑی سنجیدگی سے اس کے ساتھ گھڑی تلاش کرتا رہا اور اس کے ساتھ اسے یہ یقین دلانے کی بھی کوشش کی کہ گھڑی بلی اٹھا کر لے گئی ہے۔ کیونکہ میں نے سنا تھا کہ ایک مرتبہ یہی بلی گھڑی منہ میں ڈال کر بھاگ گئی تھی۔ زہرا بیچاری مالن کی بیٹی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ اور اس وقت کہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، وہ اپنی ماں کے ساتھ اس معصوم لڑکی کی گزشتہ حرکات کا جائزہ لے رہی ہے۔

۱۲- فروری

جب زہرا نے دیکھا کہ اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی تو اس نے نوکرانی کے ہمدست مجھے ایک رقعہ بھیجا۔ جس میں لکھا تھا:-

محترم بھیا! آپ کہتے ہیں میری رسٹ واچ بلی اٹھا کر لے گئی ہے، لیکن میں

بخوبی جانتی ہوں کہ یہ کارنامہ بلّی کا نہیں، بلکہ دو ٹانگوں والے بلّے کا ہے۔ مہربانی کر کے فوراً میری چیز اسی لفافے میں بند کر کے بھیج دیں۔ ورنہ آپ جانتے ہیں میں فطرتاً شریر ہوں اور بڑی آسانی سے آپ کا ناک میں دم کر سکتی ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ لفافے میں گھڑی رکھ کر نوکرانی کو دے دیں۔ شاید آپ کو یہ خبر نہیں کہ آپکی ایک نہایت قیمتی چیز میرے قبضے میں ہے، میں چاہوں تو اسے توڑ مروڑ کر کھڑکی سے نیچے پھینک سکتی ہوں۔ مگر آپ کے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ ہے ـــــ ہے نا؟ میں اس وقت ابّا جان کے ڈرائینگ روم میں بیٹھی گھڑی کا انتظار کر رہی ہوں۔

ہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ آپ کی اس چوری کا ذکر کسی سے بھی نہیں کرونگی۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ بھلا کون بہن اپنے پیارے بھائی جان کو بدنام کر سکتی ہے وہ ایسا کر سکنے کے باوجود بھی ایسا نہیں کریگی ـــــ ہرگز نہیں کریگی۔

آپکی پیاری بہن زہرا"

میں نے رقعے کی پشت پر لکھ دیا:۔

میری ستم ظریف بہن!

آپکا رقعہ مل گیا۔ فیصلہ کرنے میں آپ کو بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابھی

شک نہیں کہ گھڑی ایک بلّے نے اٹھائی لیکن اس نے جلد ہی اس قیمتی چیز کو تحفۂ محبت کے طور پر ایک بلّی کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ وہ گھڑی اس وقت ایک بلّی صاحبہ ہی کے قبضے میں ہے۔ منت سماجت کریں شاید بلی صاحبہ کا دل نرم ہو جائے۔ اب رہا آپکی شرارتوں کا معاملہ تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ آپ خوشی سے جو چاہیں کریں، میں ہرگز نہیں ڈرتا۔ میری جو چیز آپ کے پاس ہے اسے بیشک توڑ مروڑ کر نیچے پھینک دیں۔ لیکن اس بات کا بھی خیال رہے کہ آپ کا کمرہ میرے کمرے سے کچھ دُور نہیں اور آپ دن میں دو تین مرتبہ، اپنی پیاری سہیلیوں کے ہاں بھی جاتی ہیں — چابیوں کا گچھا بھیج رہا ہوں۔ آپ کا غم غلط کرنے کے لئے یہ اچھی چیز ثابت ہو گی۔ فقط

آپکا بھائی 'شہاب'

میں نے لفافے میں رُقعے کے ساتھ چابیوں کا گچھّا رکھ کر نوکرانی کے حوالے کر دیا۔ یقین تھا کہ زہرا اپنی اس آخری کوشش کو بھی ناکام دیکھ کر ضرور آئیگی خوشامد کرے گی۔ لیکن شام تک وہ رُوٹھی رہی۔

امی جان نے کئی بار پوچھا کہ زہرا سے لڑ پڑے ہو؟ کیا بات ہے تم آپس میں بولتے نہیں۔ لیکن میں نے ہر بار ٹال دیا۔ شام کو میں سیر کا ارادہ کر رہا تھا

کہ زہرا آئی اور آتے ہی بولی "بھیا کدھر چلے! میں تو آپ سے باتیں کرنے کے لئے آئی ہوں۔" میں نے کہا "آپ باتیں کرنا چاہتی ہیں۔ تو میں چند منٹ کے لئے ٹھہر سکتا ہوں، فرمایئے کیا ارشاد ہے؟"

ارشاد ورشاد تو کچھ نہیں ـــــ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں حساب میں بہت کمزور ہوں، اگر آپ پسند فرمائیں اور آپ کو فرصت ہو، تو مجھے اس مضمون میں مدد دیا کریں۔"

"مجھے بھی تو ایم۔ اے کی تیاری کرنا ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہوا ــــ ایم۔ اے کا امتحان دینا لوہے کے چنے چبانا ہیں۔ لیکن خیر، میں آپ کی درخواست کو رد نہیں کرتا، آدھ گھنٹہ روزانہ مدد دیا کرونگا۔"

"بڑی مہربانی" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا اور افسوسناک لہجے میں بولی۔ "ہائے میری گھڑی! خدا کے لئے اب تو دے دیجئے، وقت دیکھنے کے لئے بار بار اباجی کے ڈرائینگ روم میں جانا پڑتا ہے۔ آج شمیمہ کے یہاں دو بجے جانا تھا، مگر گھڑی پاس نہ ہونے کی وجہ سے وہاں ڈھائی بجے پہنچی۔ وہ بیچاری میرے لئے آدھ گھنٹہ پریشان رہی۔

"یہ بالکل درست ہے مگر یہ بتایئے آپ مجھے اس گھر کا آدمی نہیں سمجھتیں؛ میں تمام دن یہیں رہا ہوں اور آپ بھی تمام دن یہیں رہی ہیں آدھ گھنٹے کے لئے بھی باہر نہیں گئیں۔ کیوں ہے نا یہ بات؟"

وہ ہنسنے لگی، "گویا آپ جاسوس ہیں، خدا کی پناہ! اچھا اب دیکھئے نا آپ میرے بڑے اچھے بھیا ہیں۔"

میں نے گھڑی جیب سے نکالی اور اُسے دکھا کر کہا

"پہلے اس بات کا وعدہ کرو کہ تمام گھر والوں سے کہو گی کہ گھڑی واقعی بلّی لے گئی تھی۔"

"بلّی — ؟ اچھا مگر میں یہ کیوں نہ کہوں کہ بلّا لے گیا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک بلّا بھی آیا کرتا ہے وُہ شاید اس کا باپ ہے یا شوہر — کیا پتہ؟"

میں نے گھڑی اپنی جیب میں رکھ لی۔

"اوہو! خدا کے لئے ایسا نہ کریں۔ میں معافی مانگتی ہوں، آپ نے جو کچھ کہا ہے وُہی کہوں گی، وعدہ کرتی ہوں۔"

میں نے گھڑی جیب سے نکال کر اسے دے دی۔ اب جو اس نے باتیں کرنا شروع کیں تو ایک لمحے کے لئے بھی ٹھہرنے کا نام نہ لیا۔ کبھی اپنی ایک سہیلی

کی کنجوسی کا ذکر ہو رہا ہے تو کبھی دوسری سہیلی کی بیوقوفی کی باتیں۔ کبھی اپنی استانی کی لمبی ناک کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو کبھی اپنی کسی عزیزہ کے لمبے دانتوں کا تذکرہ اتنی دلچسپ لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی، بات بات پر لطیفہ ــــ بات بات پر ہنسی۔

میں ڈرتا تھا کہ گھڑی لے کر بھی یہ کوئی نہ کوئی شرارت ضرور کرے گی۔ چنانچہ میری یہ توقع اس طرح پوری ہوئی، کہ جب وہ میرے کمرے سے باہر نکلی تو بلند آواز سے کہنے لگی:-

"امی جان گھڑی مل گئی ہے ــــ ایک بلّی لے گئی تھی، دو ٹانگوں والا بلّا نہیں"

یہ الفاظ اس نے گھر کے ہر آدمی کو سنا دیئے، اور لطف یہ کہ اس کی سہیلی ثریّا کا ایک نوکر کوئی پیغام دینے کے لئے آیا تو اسے بھی یہ الفاظ سنا کر کہا گھر جاکر اپنی بی بی کو بتا دینا۔

ابّا جی آج رات نو بجے کی گاڑی سے لاہور روانہ ہو جائیں گے۔ وہ چند دن اور ٹھہرتے، مگر انہوں نے تایا جی کے مقدمے میں شہادت دینی ہے البتہ امی ایک ہفتہ اور رہینگی۔

۱۳۔ فروری

رات اباجی کو سٹیشن پر چھوڑ کر گھر پہنچا تو جسم میں کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی تھی اور سر بھی قدرے بھاری تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ توجہ زہرا کی طرف منتقل ہو گئی۔ میرے دل میں ایک لذت انگیز، ایک نشہ آلود خیال پیدا ہوا اور میں اس خیال کی لذت آفرینی میں اس قدر غرق ہو گیا کہ ممانی جان کیطرف جو میری طبیعت کے متعلق پوچھ رہی تھیں اچھی طرح متوجہ نہ ہو سکا۔

صبح بیدار ہوا تو طبیعت بالکل درست تھی۔ میں نے جلدی سے غسل کیا اور نوکر سے یہ کہہ کر کہ میرا ناشتہ بھی زہرا کے کمرے میں لے آئے وہاں پہنچا۔ زہرا میرے جانے سے پیشتر ہی اپنی کسی سہیلی کے ہاں چلی گئی تھی۔ میں مایوس ہو کر کوچ پر لیٹ گیا۔ پھر سوچا آخر اس مایوسی کی وجہ؟ زہرا اپنی سہیلی کے یہاں گئی ہے، دو تین گھنٹوں کے بعد آجائے گی۔ اس میں مایوسی کی وجہ کیا ہے؟ اسی دوران میں محسوس ہوا کہ جسم میں حرارت عود کر آئی ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ سیر کو نہیں گیا۔ میں نے سوچا اور جھٹ چھڑی لے کر کوٹھی سے باہر نکل آیا۔

ندی کے کنارے زہرا اپنی سہیلی کے ساتھ بیٹھی کچھ کھا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ میں ان کے قریب سے گذر کر پہاڑی کے اوپر چڑھ گیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد

زہرا آموجود ہوئی۔ میں نے پوچھا۔" مجھے دیکھ کر تم نے منہ کیوں موڑ لیا تھا، میری شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھیں ؟"

وہ قدرے پریشان ہو گئی۔" بھیا! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں، میں اور آپ کی شکل سے نفرت! یہ تو قیامت تک بھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو آپ کی شکل سے ...... سچ کہتی ہوں آپ کی شکل بہت اچھی ہے۔ معلوم نہیں آپ کو بعض اوقات کیا ہو جاتا ہے، ذرا سی بات پر روٹھ جاتے ہیں اور مجھے منانا پڑتا ہے۔"

واقعی زہرا جب مجھے ذرا پریشان دیکھتی ہے تو خود بھی پریشان ہو جاتی ہے امی جان سچ کہتی ہیں۔ میں بہت حساس ہو گیا ہوں، اب عہد کر لیا ہے کہ شدتِ احساس کو دل سے نکال دوں گا۔ کیا لغو، کتنی بیہودہ بات ہے استغفر اللہ!

اگر میں یہ سمجھوں کہ زہرا کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے، یا مجھے زہرا سے محبت ہو گئی ہے تو اس میں جھوٹ کیا ہے؟ ...... محبت ...... کتنا پیارا لفظ ہے، کتنا دل نواز لفظ ہے، محبت ...... زہرا ...... زہرا ...... محبت! میرے اللہ! میں تیرا شکریہ ادا کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا ...... ایک اور مژدہ جانفزا سنا ہے ماموں جان کالج میں وائس پرنسپل مقرر ہو گئے ہیں۔ اور لوگوں کا خیال ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک سال تک پرنسپل بھی ہو جائیں گے۔ کیونکہ پرنسپل

صاحب ریٹائر ہو جائیں گے۔

۲۸۔ فروری ـــــــــــــــــــ!

آج کل میری زندگی کے صرف دو مقصد ہیں۔ ایک تو کتابوں کا مطالعہ، اور دوسرے شاہ بلوط کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں اپنی زہرا سے باتیں کرنا۔ مجھے کتابوں کے مطالعہ کا پہلے بھی شوق تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ جو لذت آج کل مطالعے میں حاصل ہوتی ہے وُہ آج تک حاصل نہیں ہوئی تھی۔ رُومانی قصّے تو خاص طور پر اپنے اندر جاذبیت، اور کشش رکھتے ہیں، اِن دِنوں جان کیٹس اور بائرن کی دِل آویز نظموں کا مطالعہ جاری ہے۔ ان کی پیاری پیاری نظمیں پڑھتے وقت وُہی لذت آگیں درد سینے میں پیدا ہونے لگتا ہے جو انگلستان کے اِن دو جوانمرگ شاعروں نے اپنا اپنا افسانۂ محبت لِکھتے وقت محسوس کیا ہوگا ـــ خدا کرے تمام زندگی اسی طرح گزر جائے۔

کل ایک عجیب واقعہ رُونما ہُوا۔ زہرا نے ثریا کو کھانے پر بلایا تو رشیدہ نے گلہ کیا کہ "ہمیں بھول ہی گئیں شاباش ہے تم پر"۔ اس لئے کل شام سے کچھ دیر پیشتر اس نے نوکر بھیج کر رشیدہ کو بُلا لیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم چار۔ دل رشیدہ، زہرا میں اور فیروز سیر کے لئے کوٹھی سے باہر نکل آئے۔ ٹہلتے ٹہلتے شاہ بلوط کے نیچے پہنچے

رشیدہ کچھ دیر ٹھہر کر چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے غیر ارادی طور پر درخت کے تنے پر اپنا نام پنسل سے لکھ دیا۔ زہرا اُسے دیکھ کر بولی "یہ ٹھیک نہیں۔ یہ لو چاقو، اس سے نام کھود دو"۔ میں نے چاقو سے اپنا نام کھودا تو وہ بولی "میرا نام بھی، آخر ہم نے کیا قصور کیا ہے؟" ـــــ میں نے اس کا نام بھی کھودا۔ وہ ایک کامل الفن نقاد کی مانند کھُدے ہوئے ناموں کو دیکھنے لگی اور مسکرا کر بولی "ہم نے سُنا ہے درخت کے تنے پر نام کھودے جائیں تو وہ کبھی نہیں مٹتے، بارش آئے آندھی چلے، اولے پڑیں مگر یہ حروف محو نہیں ہو سکتے"۔

اس وقت اس کی پیاری پیاری آنکھوں میں کچھ ایسی چمک پیدا ہو رہی تھی جو سنگ مرمر کی شفاف سطح پر سُورج کی کرنوں سے نمایاں ہوتی ہے۔ اس نے کسی فوری جذبے کے ماتحت جیب سے رومال نکالا اور اسے چہرے پر رکھ کر پرے جا بیٹھی۔ اس کے سیمیں ہاتھ پر اس کا گلگوں چہرہ اس طرح نظر آرہا تھا، جس طرح بلوریں گلدان میں گلاب کا دستہ پڑا ہو ـ میں اُٹھ کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا وہ قدرے گھبرا کر بولی "اوہو! بڑی دیر ہو گئی، چلو گھر ـــ وہ پریشان ہو نگے یہ فیروز بھی کتنا پاگل ہے ہمیں بتایا ہی نہیں کہ شام ہو چکی ہے"۔

میں اس کے معصومانہ اندازِ گفتگو پر بے اختیارانہ ہنس پڑا۔ کوٹھی پہنچے تو

ماموں جان بولے "جلدی آجایا کرو، یہ ویران مقام ہے"

۲۵-مارچ

زندگی ایک مسلسل رنگین و خوشگوار خواب بن گیا ہے، ایک دلچسپی سے طبیعت سیر نہیں ہوتی، کہ ایک اور دلچسپی آموجود ہوتی ہے۔ ایک شغل ختم نہیں ہوتا کہ اسکی بجائے دوسرا شغل میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

زہرا — میری زہرا، میری تمام آرزوؤں کا مرکز بن گئی ہے۔ وہ میرے پاس ہوتی ہے تو یہ رنگین دنیا اور رنگین نظر آنے لگتی ہے اور وہ کہیں چلی جاتی ہے تو یہ مسرور زندگی اس کے حسین و جمیل تصورات کے جھولے میں جھولنے لگتی ہے۔ آہ، وہ وقت کتنا پیارا وقت تھا جب میں نے یہاں آنے کے لئے گھر سے باہر قدم رکھا اور آہ وہ لمحہ کس قدر محبوب لمحہ تھا جب پہلے پہل میری نگاہ زہرا پہ پڑی۔ زہرا — میرے دل کی مالکہ، میرے دل کا راز جان چکی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ کیوں بار بار ایسا کہتی ہے۔ کہ تم یہیں رہو گے، تمہیں یہیں رہنے پر مجبور کیا جائیگا — اور مجبور کیوں کیا جائے گا تم خود مجبور ہو!"

جب یہ محبوب ترین ہستی اپنے گلرنگ لبوں سے یہ الفاظ نکالتی ہے تو اس وقت کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے، جی چاہتا ہے وہ یہ الفاظ بار بار کہے — بار بار

مسکرائے اور بار بار اپنے ہونٹوں سے پھول برسائے۔ کتابوں میں پڑھا کرتا تھا کہ محبت کائنات کا سب سے قیمتی خزانہ ہے جو دُنیا کے خوش نصیب انسان ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ میں یہ الفاظ پڑھ کر سوچا کرتا تھا۔ اِس میں کوئی اصلیت بھی ہے یا نہیں آج معلوم ہوا کہ یہ فقرہ بالکل صحیح ہے۔ محبت واقعی کائنات کا سب سے قیمتی خزانہ ہے۔ اور یہ قیمتی خزانہ مجھے حاصل ہو گیا ہے۔

ممانی جان کہتی ہیں۔ "یہاں آ کے ماشاء اللہ تمہاری صحت میں بہت تبدیلی ہو گئی ہے، اگر یہی حال رہا تو ایک دن پہلوان بن جاؤ گے۔" میں خود محسوس کرتا ہوں کہ اب میری جسمانی حالت میں ایک نہایت خوشگوار تبدیلی رونما ہو چکی ہے، لاہور میں تو صحت گر چکی تھی، ہر وقت ہلکا ہلکا بخار رہتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں رات کے دو بجے تک پڑھتا رہتا تھا۔ مگر یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ پڑھتا تو اب بھی ہوں — صحیح وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں مجھے اپنے جسم کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی، ہر وقت مطالعہ اور مطالعہ بھی ایک تنگ کمرے میں —— یہ کمرہ اب جہنم معلوم ہوتا ہے۔

ماموں جان نے نہر کے پار ایک نئی کوٹھی خرید لی ہے۔ آج اس کوٹھی کو دیکھا ہے۔ نہایت شاندار اور وسیع کوٹھی ہے، چاروں طرف باغ ہیں اور ہر باغ خوبصورت ہے۔ فی الحال یہ کوٹھی خالی نہیں۔ دو تین ماہ تک کرایہ دار چلے جائیں گے پھر

ہم ادھر چلے جائیں گے۔

۲۷- مارچ ________________ !

زہرا سے اتنی محبت ہو گئی ہے کہ اب ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ سیر کرتا ہوں تو اس کے ساتھ، مطالعہ کرتا ہوں تو اسکے قریب بیٹھ کر اور تاش کھیلتا ہوں تو اُسی کے کمرے میں بیٹھ کر ـــــ زہرا کی روش میں بھی ایک نمایاں تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ تمام گھر والے کہتے ہیں کہ پہلے با تو یہ سہیلیوں کے پاس چلی جاتی تھی یا سہیلیاں اس کے پاس آ جاتی تھیں۔ مگر اب کبھی سہیلی کا رقعہ نوکر لے کر آتا ہے تو کہہ دیتی ہے۔ "اس وقت بہت مصروف ہوں کل آؤں گی۔" اس کی سہیلیاں اسکی موجودہ روش پہ حیران ہیں۔ شاید وُہ سب کچھ سمجھ چکی ہیں۔

صبح بہت دُور تک سیر کرتا ہوا چلا گیا۔ گھر آیا تو جسم میں حرارت ہو رہی تھی اور اب تک موجود ہے۔ غسل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ لاہور میں بھی جب کبھی طبیعت مضمحل ہوتی تھی تو صرف یہی علاج کرتا تھا۔

۳۰- مارچ ________________ !

جب دل میں مسرت کا طوفان موجزن ہو، دماغ میں کیف و نشاط کی لہریں اٹھ رہی ہوں اور رُوح پر ایک وجد سا طاری ہو تو بہت کچھ لکھنے کی آرزو کے باوجود

کچھ بھی نہیں لکھا جاتا یہی حال میرے ساتھ پیش آ رہا ہے۔ مکمل پانچ دن سے ڈائری میں .... ہر روز کئی مرتبہ ارادہ کرنے کے باوجود کسی سطر کا اضافہ نہیں کر سکا۔ اس وقت زہرا یہاں موجود نہیں، اس لئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر ایمرسن، کالج کا پرنسپل بیمار ہو گیا ہے اس لئے بہت جلد ولایت چلا جائے گا۔ ان کی رخصت پر ماموں جان پرنسپل ہو جائیں گے۔ پہلے بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی تھی اور اب تو میرے پروفیسر ہو جانے کی پوری پوری توقع ہے۔

ابا جان کی طرف سے خط پہنچا ہے۔ اس میں تاکید کی گئی ہے کہ ماموں جان اور ممانی صاحبہ کی انتہائی فرمانبرداری کرنا، وہ تمہیں وہیں رکھنا چاہتے ہیں اور ہمارا سر تسلیم ان کے حکم کے سامنے خم ہے۔ ایک خط ماموں جی کو بھی آیا ہے، میں اسے پڑھ نہیں سکا۔ ممانی جی فرماتی ہیں "اس خط میں لکھا ہے کہ تم یہیں رہو گے۔"

یہاں رہنے کی آرزو بھی پوری ہو گئی۔ میری تمام باتیں میری توقع کے مطابق ہی ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ راحت انگیز بات یہ ہے کہ میری محبوب ترین ہستی، میری ناز آفریں زہرا، میری زندگی سے وابستہ کر دی جائے گی۔ کل میں غسل خانہ میں تھا۔ تو ہماری بوڑھی باورچن نوکر سے کہہ رہی تھی۔ "بابو شیخ صاحب کا داماد بن رہا

ہے۔ بہت خوش قسمت ہے جس شخص کو۔ شیخ صاحب جیسا سسر مل جائے اسے اور کیا چاہیئے، تمام عمر مزے کریگا۔ اتنی جائداد ہے، کوٹھیاں ہیں اور سوائے بیٹی کے اور کوئی اولاد ہی نہیں۔"

اِس مژدۂ روح نواز نے میری رگ رگ میں کیف و انبساط کی لہریں دوڑا دی ہیں۔ ماموں جی کے اصرار پر صبح اُن کے کالج کے ڈاکٹر کے یہاں گیا تھا۔ کہتا تھا" بخار تمھارے جسم میں سرایت کر چکا ہے باقاعدہ علاج کرانا ہوگا"۔

باقاعدہ علاج، استغفر اللہ! یہ ڈاکٹر لوگ بھی عجیب قسم کے انسان ہیں، ذرا سی تکلیف ہوئی اور اُنھوں نے فتوے لگا دیا۔ خدا بچائے ان لوگوں سے، دن میں دو تین گھنٹے ہلکی سی حرارت ہو جاتی ہے، دُور ہو جائیگی۔

صبح مذاق کے طور پر زہرا سے کہا۔" ڈاکٹر کہتا ہے تمہاری حالت بہت مخدوش ہو جائے گی، جان کے لالے پڑ جائیں گے"۔

یہ سن کر وہ مجھ سے رُوٹھ گئی اور جب میں نے وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی بھی یہ چھوٹے الفاظ منہ سے نہیں نکالوں گا۔ تو اس نے صلح کر لی۔ خدا نہ کرے، کبھی بیمار ہو گیا۔ تو اس کے دل کو کتنا صدمہ پہنچے گا۔ وہ کس قدر پریشان ہو گی؟

۷۔ اپریل ——————— !

کل میری سالگرہ تھی، ماموں جان نے دُنیا کے مشہور مصنفوں کی کتابوں سے بھرا ہوا بکس دیا۔ ممانی صاحبہ نے سنہری رسٹ واچ اور میری زہرا نے ہاتھی دانت کا ایک خوبصورت صندوقچہ۔ سالگرہ سے ایک ہفتہ پیشتر ہی وُہ کہہ رہی تھی:" بھیا! تمہاری سالگرہ پر ایسی چیز دوں گی کہ تمام عمر یاد رکھو گے۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر تمہارے لئے منگوائی ہے۔"

صندوقچہ مقفل تھا۔ اس کے ساتھ چابی بھی لٹک رہی تھی۔ میں نے اسے کھولنا چاہا۔ تو وہ کہنے لگی۔" نہیں بھائی جان! یہ نہیں ہوگا۔ اپنے کمرے میں جاکر کھولنا۔" میرے دل میں شک پیدا ہو گیا۔ مَیں وہیں اُسے کھولنے لگا۔ زہرا بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ صندوقچے میں سے کوئی چیز ریشمی رومالوں میں لپٹی ہوئی ملی۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا — حتیٰ کہ پانچ رومال اتارے۔ پانچواں رومال اُتارا تو ایک چینی کی مینڈک سامنے آگئی۔ سب ہنسنے لگے۔ چند دن کے بعد اس کی بھی سالگرہ ہے۔ بدلہ لے لُونگا۔

شام کو کھانے پر بہت تکلف تھا۔ نہ معلوم کون سی بدپرہیزی کر دی کہ اب تک بخار ہے۔

۱۹-اپریل

چار دن سے بیمار ہوں۔ عجب قسم کی بیماری ہے۔ کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد تھک گیا ہوں اور کبھی محسوس ہوتا ہے گویا جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی ہیں، نرالی کیفیت ہے۔

زہرا ہر وقت میرے پاس بیٹھی رہتی ہے۔ میری طبیعت بستر پر لیٹے لیٹے بہت اکتا گئی ہے۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ کب تک پلنگ پر پڑا رہوں۔ مجھے دوائی سے نفرت ہے اور ماموں جان صبح شام ڈاکٹر کے ہاں جانے کی تاکید کرتے ہیں۔

چند دِن تک ماموں جان ایبٹ آباد جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں تم بھی ساتھ چلنا۔ آب و ہوا کی تبدیلی صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔ خدا کرے مجھے یہاں رہنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ مل جائے۔ زہرا سے جُدا ہونا بہت مصیبت ناک امر ہے۔

۲۷-اپریل

ایبٹ آباد میں آ گیا ہوں۔ تبدیلیٔ آب و ہوا نے بہت خوش گوار اثر ڈالا ہے۔ ماموں جان پندرہ دِن یہاں رہیں گے۔ اور مجھے ٹھہرنا ہو گا۔ ابھی صرف دو دن بیتے ہیں۔

۲۸- اپریل ______ !

رات قریباً ایک بجے تک اپنے میزبان کے لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلتا رہا، اس لئے صبح دس بجے آنکھ کھلی۔ سر میں درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں، طبیعت بہت مضمحل تھی، میں بیدار ہو کر بھی بستر پر لیٹا رہا۔ اتنے میں قریب کی کوٹھی سے گراموفون ریکارڈ کی آواز آئی :-

"پیا بن ناہیں آوت چین"

یوں محسوس ہوا جیسے میری محبوبہ کی نازک، سرد انگلیاں دل کو چھو رہی ہیں زہرا کا مسکراتا ہوا، دمکتا ہوا، دل نواز و دل آویز چہرہ نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔ آناً فاناً تمام اضمحلال دُور ہو گیا۔ ریکارڈ ختم ہوتے ہی میں کوٹھی سے نکل کر چلنے لگا۔ جب طبیعت ہشاش بشاش ہو، دل میں اپنی محبوبہ کی یاد مچل رہی ہو، اور رت بھی انتہائی خوش گوار ہو تو یہی جی چاہتا ہے کہ انسان چلتا جائے بغیر کسی مقصد کے بغیر کسی ارادے کے قدم اُٹھاتا چلا جائے۔ کہیں بھی نہ رُکے، کسی جگہ بھی نہ ٹھہرے۔ چنانچہ میں نیلے نیلے پہاڑوں کے دامن میں سے گزرتا ہوا بہت دور چلا گیا۔ واپسی پر پھر حرارت ہونے لگی۔ اور اب تو سینے میں ہلکا ہلکا درد بھی ہو رہا ہے۔ ماموں جان کو اس امر کی خبر نہیں کہ میرا دل کتنا اداس ہے۔ وہ نیئے نیئے انتظام کر رہے ہیں پہلی

منگواتے ہیں، سیر کراتے ہیں، نئی نئی تفریحات میں حصہ لینے کے لئے کہتے ہیں۔ اور میرا دل ہے کہ کسی وقت بھی چین نہیں لیتا۔

ماموں جان کو کون سمجھائے کہ آپ یہ احسان نہ کریں۔ سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ زہرا کے پاس بھجوا دیں۔ لیکن کہے کون؟

۳۰-اپریل

زہرا کی طرف سے ایک طویل خط پہنچا ہے۔ خط کی ہر سطر سے بیتابانہ محبت ٹپک رہی ہے۔ لکھتی ہے میں بہت اداس ہو گئی ہوں، پھر بھی خوش ہوں کہ جب تم یہاں آؤ گے۔ تو بہت لحیم و شحیم ہو گے۔

کل میں نے سرسری طور پر ماموں جان سے کہا کہ میری طبیعت اداس ہو گئی ہے۔ انہوں نے میرے الفاظ کی طرف کوئی توجہ نہ کی، انہیں کبھی یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ گونا گوں تفریحات کے باوجود اور اتنی خوش گوار و حیات بخش آب و ہوا کے باوجود میری طبیعت گھبرا سکتی ہے۔

رات تاش کھیلتے ہوئے ایک بہت بری حرکت کا ارتکاب کر دیا۔ طبیعت بہت مضمحل تھی اور جب میں بازی ہار گیا اور شاہد نے چھیڑنا شروع کیا تو میں نے دو تین تلخ الفاظ کہہ دیئے۔ بیچارہ بہت شرمندہ ہوا۔ ماموں جان بھی کہتے ہیں

"نہ معلوم بعض اوقات تمہاری باتوں میں تلخی کیوں آجاتی ہے"!

میں خود بھی محسوس کرتا ہوں کہ ایسا ہو جاتا ہے۔ شام کو نوکر کو بھی بلا کسی وجہ کے جھڑک دیا۔

۳-مئی ——————— !

'محبت کیا ہے'۔ اس موضوع پر مسٹر ارشد سے رات دیر تک باتیں ہوتی رہیں ارشد صاحب فلسفے کے طالب علم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے پر فلسفیانہ نقطۂ نظر ہی سے روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ محبت محض ایک تقاضائے شباب ہے اور بس۔ زندگی کے مختلف طبقات ہیں اور ہر طبقے میں ایک جذبہ باقی تمام جذباتِ انسانی پر غالب آجاتا ہے۔ اس عالم میں جو کچھ کیا جاتا ہے اسی جذبے کے زیر اثر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ محبت کا جذبہ جوانی میں اتنی قوت حاصل کر لیتا ہے کہ باقی تمام جذبات، باقی تمام خیالات اس کے سامنے تنکوں کی مانند حقیر اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ مگر میں اس نظریئے کا قائل نہیں ہو سکتا — کسی صورت بھی نہیں ہو سکتا۔ اس خوفناک اور واہیات نظریے کا قائل ہونا اس امر کے مترادف ہے کہ جیسے ہی جوانی سرد پڑ جائے گی، میری محبت کا شعلہ بھی بجھ جائے گا۔ اُف! فلسفہ کس قدر گمراہ ہے، کس درجہ خطرناک، کتنا حقیقت سے گریزاں!

زہرا میرے دل — میرے دماغ — اور میری رُوح پر اس طرح چھا چکی ہے کہ دن میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا، جب اس کا شگفتہ و خنداں چہرہ میری نگاہوں کے سامنے موجود نہ ہو۔

"زہرا" — یہ میٹھا، پیارا اور دل نواز نام لیتے ہی نہ معلوم مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کا اظہار دُنیا کے کس اہل قلم کی دسترس میں ہے؟

۴ مئی ————————!

میری محبوبہ اس وقت مجھ سے دور، ایک خوبصورت کمرے میں صوفے پر بیٹھی کچھ سوچ رہی ہو گی۔ اس کی آنکھیں درخشاں اور ہونٹ مرتعش ہونگے۔ میں نے اپنے خط میں اُسے "ملکۂ دل" سے مخاطب کیا ہے، کہیں ناراض نہ ہو جائے۔ ..... اوہ میرے دل میں کتنی بدگمانی موجود ہے۔ وہ کیوں ناراض ہونے لگی۔ وہ تو صحیح معنوں میں ملکۂ دل ہے، مرکزِ امید ہے، محورِ تمنا ہے، سرمایۂ کائنات ہے۔

خط میں لکھتی ہے "میں ہر وقت فکر مند رہتی ہوں، خدا کے لئے بیماری کی اتنی ناز برداری نہ کیا کرو۔"

کتنا خوبصورت فقرہ ہے آہ میں کیا کروں! حرارت ہر روز دن کے چار بجے جسم پر قابض ہو جاتی ہے۔ اب تک کئی بوتلیں خالی کر چکا ہوں۔ مگر بخار جانے کا

نام ہی نہیں لیتا۔ کل یا پرسوں یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، ماموں جان کو آخر میرے اصرار کے سامنے جھکنا پڑا ہے۔

۷۔ مئی

محبت بھی کتنی عجیب نعمت ہے۔ ایبٹ آباد حقیقی معنوں میں ایک جنت ہے مگر اس جنت میں میرا دل ایک دن کے لئے بھی نہ بہل سکا اور اب یہاں آ یا ہوں تو نہ جسم میں حرارت باقی ہے، نہ سینے میں درد ہے اور نہ اعضا شکنی کی شکایت۔ یہ سب کچھ محبت کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے، میری عدم موجودگی میں ممانی جان اور میری زہرا نے کوٹھی کے دونوں باغوں کو بہت سرسبز و شاداب بنا دیا ہے اور ایک باغ میں میری آرزو کے مطابق جالی سے ایک کمرہ بھی تیار کر دیا گیا ہے۔ میں نے ویسے ہی اس آرزو کا اظہار کیا تھا لیکن ممانی جان کی مادرانہ شفقت میری ہر آرزو کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتی ہے۔

آج دن کا بیشتر حصہ اپنے ڈرائینگ روم میں فرنیچر وغیرہ رکھوانے میں گزر گیا۔ زہرا نے اس کام میں بڑی دلچسپی لی۔ واقعی اس کا حُسنِ ذوق ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔ ہر چیز کمرے میں اس انداز سے رکھوائی ہے کہ معلوم ہوتا ہے، یہ جگہ صرف اسی چیز کے لئے موزوں تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں تھک کر صوفے

پر بیٹھ گیا اور اپنا سر زہرا کی آغوشِ ناز میں رکھ دیا۔ وہ اپنے مخملیں ہاتھ میرے رخسار و
پر پھیرنے لگی۔ اس وقت محسوس ہوتا تھا گویا ہم اِس دُنیا سے نکل کر "گیتوں کی دُنیا" میں
پہنچ گئے ہیں، جہاں ہر طرف ایک رومان انگیز ہلکا ہلکا کہر چھایا ہوا ہے، عطر و نکہت
کی لہریں اِرد گرد و بتر رہی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں میں نے کب اپنے ہاتھ اس کی گردن میں
حمائل کئے۔ کس وقت اپنے ہونٹ اس کے قریب لیگیا۔ مجھے کچھ بھی خبر نہیں تھی کہ
میں کیا کر رہا ہوں۔ یکایک زہرا کے رخسار گلگوں ہو گئے۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے ہونٹوں
پر پھیرا اور جلدی سے اُٹھ کر دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی، مجھے اس وقت
اس کا چہرہ بیحد حسین، بیحد دلکش نظر آ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا، اُسے اپنے دل میں رکھ لوں
اور اس طرح اس کے ہونٹوں سے ہونٹ مِلاؤں کہ دونوں ایک دوسرے میں تحلیل ہو
جائیں۔ میں اُٹھا ـــ وہ میرا ارادہ بھانپ گئی، مسکرا کر بھاگی۔ میں بھی اس کے پیچھے
بھاگنے لگا۔ باورچی خانے سے گزرتے وقت اس کا دوپٹہ ایک کیل سے الجھ گیا۔ اس
نے جلدی سے دوپٹہ اتار دیا اور پھر بھاگنے لگی۔ ڈرائینگ روم میں پہنچ کر میں نے
اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے رخسار اور سُرخ ہو گئے اور وہ کہنے لگی۔ "اُوں ـــ کیا
کرتے ہو چھوڑو بھی۔ امی دوسرے کمرے میں ہیں۔"

مگر میں جانتا تھا کہ ممانی جان غسل خانے میں تھیں۔ میں نے اسے اپنے آغوش

میں بھینچ لیا اور پھر اُس کے رخساروں کو، آنکھوں کو، بالوں کو بیتابی سے کئی بار چوم چُوم لیا۔ آہ یہ وقت کتنا حسین تھا، دل و دماغ میں عطر کی لپٹیں تیر رہی تھیں، اور اب تک تیر رہی ہیں۔

۹۔ مئی

رات سے پھر بخار ہو گیا ہے، طبیعت بہت افسردہ ہے۔ صبح ڈاکٹر کے یہاں گیا، وہ کافی دیر تک سٹیتھ سکوپ سے سینے کا جائزہ لیتا رہا۔ جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "تمہاری بیماری خطرناک ہے، اس لئے تمہیں باقاعدگی کے ساتھ اپنا علاج کروانا چاہیئے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو خطرے کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔"

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بیماری آ کہاں سے گئی۔ ڈاکٹر کہتا ہے تمہیں ہر روز شام کے قریب بخار ہو جاتا ہے مگر میں کہتا ہوں کبھی کبھی حرارت ہو جاتی ہے۔ شاید ڈاکٹر درست کہتا ہے۔ دلچسپیوں کے ہجوم میں اس طرف توجہ دے ہی نہیں سکتا۔

زہرا کے ماموں کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے اسلئے ماں بیٹی ادھر چلی گئی ہیں۔ میں اس وسیع کوٹھی میں تنہا ہوں۔ آج پہلی بار محسوس ہوا ہے کہ میں بیمار رہتا ہوں سینے میں درد ہے — کھانسی آتی ہے اور یہ سب چیزیں خطرے کا اعلان کر رہی ہیں۔

نہ معلوم میری زہرا کب آئیگی۔ کم از کم تین دن تو وہاں رہیگی۔ اس کے ماموں کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ کتنی بڑی خوشی کی بات ہے۔ مسرور ہنگاموں میں اتنی فرصت کہاں کہ میری طرف خط لکھے۔

۱۱۔ مئی

صبح اٹھا تو نسیم سحری کے سرد جھونکوں، ہر طرف کھلے ہوئے رنگین پھولوں، اور ننھی ننھی چڑیوں کے مسرت پاش نغموں نے طبیعت پر اچھا اثر کیا۔ میں نے ارادہ کر لیا، کہ شام تک باغ ہی میں رہوں گا۔ چنانچہ آٹھ بجے سے دس بجے تک ریڈیو سنتا رہا، پھر کتاب کی طرف توجہ کی، لیکن آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، اس لئے دل بہلانے کے لئے کوئی اور مشغلہ ڈھونڈا۔ دونوں مالیوں کو بلایا اور تمام گملوں کو از سر نو قطار کے اندر رکھوا دیا۔ سوکھی ہوئی گھاس باہر پھنکوائی اور اسی قسم کے دوسرے کاموں میں دو بجے تک مشغول رہا۔ چار بجے ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ وہ مکمل آدھ گھنٹہ تک مختلف "آلات ڈاکٹری" سے پیٹ اور سینے کو ٹھونک بجا کر دیکھتا رہا۔ کہتا ہے "تم باقاعدگی سے علاج نہیں کراتے، پرہیز کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔"

مجھے دوائیوں سے سخت نفرت ہے۔ آدھی بوتل پیٹ میں ڈالتا ہوں۔

اور آدھی زمین پر بہا دیتا ہوں، کیا کروں یہ کڑوی دوائیاں طبیعت پر اور بھی بُرا اثر ڈالتی ہیں۔

۱۲ ۔ مئی ——————— !

ممانی جان اور زہرا کو آج آجانا چاہیئے تھا، مگر وہ نہیں آئیں۔ انہیں کیا خبر میرا کیا حال ہے؟ والدین مطمئن ہیں کہ بیٹا بالکل صحت مند ہے۔ ماموں، ممانی اور زہرا سمجھتی ہیں کہ موسمی بخار ہے، دو چار دن میں جاتا رہے گا، طبیعت بحال ہو جائیگی۔ اور ڈاکٹر —— وہ ظالم انسان صبح و شام دن میں دو مرتبہ —— آنے والے خطرے کی پیشین گوئی کرتا رہتا ہے اور میں —— میری نگاہوں میں یہ علالت ایک حقیر چیز ہے، فرقت کی تکلیف کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جیسے ہی میری زہرا میرے سامنے آجاتی ہے یہ علالت ولالت خواب و خیال ہو جائے گی۔ جب یہ حال ہے، تو ان کڑوی کسیلی، زہریلی دوائیوں کو پینے کی ضرورت؟ ان کی جگہ میرا پیٹ نہیں، کھڑکی کے نیچے مٹی کا تودا ہے۔

۱۳ ۔ مئی ——————— !

شاید زہرا آج بھی نہیں آئیگی، اسے آنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بیمار میں ہوں، وہ تو نہیں ہے۔ اسے اپنے ماموں کے ہاں بے شمار دلچسپیاں میسر

ہیں۔ اُسے اپنے بیمار محب کی کیا پروا! جیسے ہی وُہ لوگ یہاں آتے ہیں مَیں لاہور چلا جاؤنگا
اسے بھی تو معلوم ہو کہ جب دوسرے کی پروا نہ کی جائے تو دوسرا بھی پروا نہیں کرتا
طبیعت ہر وقت سست رہتی ہے! کھانسی میں بھی ترقی ہو گئی ہے۔

ماموں جی کے ساتھ طے ہو چکا ہے، کہ موسمِ گرما کے دو مہینے کشمیر میں گزاریں گے۔ زہرا بھی ساتھ ہو گی۔ اس جنت نظیر وادی میں خوب لطف رہیگا۔

۱۲- مئی

ممانی جان اور زہرا کو آئے ہوئے کئی دن گزر چکے ہیں۔ اس دَوران میں دوائیوں کے باقاعدہ استعمال سے بخار ہلکا ضرور ہو گیا ہے مگر تاحال ٹوٹا نہیں۔ سیر سے واپس آؤں یا باغ میں ٹہلوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی ایک لمبا سفر طے کر کے واپس آیا ہوں۔ کھانسی نے ناک میں دم کر دیا ہے، کمبخت شروع ہوتی ہے تو رُکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ سیر و سیاحت میں میرے لئے بہت دلچسپی ہے لیکن جب تھوڑا سا فاصلہ طے کر لینے پر تھک جاؤں اس وقت اس مشغلے میں خاک لطف حاصل ہو سکتا ہے؟

زہرا آج کل بہت فکر مند نظر آتی ہے۔ بیچاری گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہتی ہے اور جیسے ہی دوائی پینے کا وقت ہو جاتا ہے، خود گلاس میں دوائی انڈیل کر پلاتی ہے اور ہر طرح تسلی و تشفی دیتی ہے۔ فرصت کے وقت گلدستے بنا کر،

میرے سرہانے رکھتی ہے اور نئے نئے لطیفوں سے میرا دل بہلاتی ہے۔

۳۔ جون ——————— !

کل ہمیں اپنے پروگرام کے مطابق کشمیر کو روانہ ہو جانا چاہیئے۔ لیکن اباجی کا خط آیا ہے کہ وُہ امی جان کو ساتھ لے کر آرہے ہیں، ان کے جانے کے بعد کشمیر کو روانہ ہونگے۔ وُہ زیادہ سے زیادہ دو دن رہیں گے۔ کیا ان دو دنوں میں بخار ٹوٹ جائے گا، کھانسی جاتی رہے گی؟ خدا کرے ایسا ہو۔ اگر کشمیر میں بھی جا کر یہی حالت رہی تو تمام مزا کرکرا ہو جائے گا۔ اتنا شاندار پروگرام بنایا ہے تو طبیعت بھی ٹھیک ہونی چاہیئے، تاکہ اس وادیٔ مینو سواد کے ہر خطّے سے لطف حاصل کیا جائے۔

ڈاکٹر نے کہا ہے "کشمیر کی آب و ہوا تمہارے لئے بہت مفید ثابت ہو گی جتنی جلدی ہو سکے وہاں جاؤ، مَیں تین ہفتوں کی دوائی دے دونگا، ضرورت ہُوئی تو اَور دوائی بعد میں منگوا لینا۔"

میری انتہائی آرزو یہ ہے کہ بخار یہیں ٹوٹ جائے۔ ان کڑوی کسیلی دواؤں کی طرف دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ نہ معلوم ان لوگوں کی طبیعت کیسی ہے جو سال سال تک پلنگ پر پڑے یہ کڑوا پانی اپنے پیٹ میں ڈالتے رہتے ہیں۔

خدا بچائے ایسی مُصیبت سے، اِس کا تو خیال ہی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لِئے کافی ہے۔

صرف دو دِن باقی ہیں۔ کاش یہ حرارت، یہ کھانسی اس طرح دُور ہو جائے گویا کبھی تھی ہی نہیں۔

۱۶-جُون ——————— !

یہ کشمیر ہے —— ہندوستان کی جنت —— بہاروں کا مسکن —— رنگینیوں کا مخزن —— حُسن و عشق کی سرزمین، اَور آج کل میں اسی اَرضی فردوس میں سانس لے رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے تمام کرّہ ارض میں اتنا شاداب و حسین کوئی خطہ نہیں ہو گا۔ ہر طرف دِلآویز، شگفتہ، مسکراتے ہوئے پھُولوں کی بہار! ہر جانب میٹھے، صاف شفاف چشمے! اَور ہر سُو پہاڑوں کے دامنوں میں لہراتی ہوئی سفید، کالی نیلی بدلیاں —— اَیسی دِلکش فضا میں سوائے سیر کے اَور کوئی کام سوجھتا ہی نہیں اَور حقیقت یہ ہے کہ اَور کام ہو بھی کیا سکتا ہے؟

۱۹-جُون ——————— !

دو مہینے تک یہاں قیام رہے گا۔ امید ہے اس عرصے میں صحتِ کاملہ حاصل ہو جائے گی۔ جب سے یہاں آیا ہوں طبیعت میں کافی فرق محسوس کرتا ہوں۔ وُہ

لوگ پاگل ہیں جو کڑوی دوائیوں سے دل و دماغ کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔ انہیں یہاں آ جانا چاہیئے، ناممکن ہے وُہ تھوڑے سے عرصے میں صحت یاب نہ ہو جائیں۔
زہرا میری موجودہ صحت پر بہت خوش ہے اور میں جہاں جاتا ہوں، میرے ساتھ جاتی ہے۔ ایک تو اُس کی موجودگی ہی بہت بڑی نعمت ہے اور پھر کشمیر کی صحت بخش آب و ہوا! بہت لطف رہتا ہے۔ کل ہم ایک شیریں چشمے کے کنارے بیٹھے تھے۔ زہرا ہولے ہولے اپنے ہاتھ سے چھینٹے اڑا رہی تھی۔ میں نے کہا "زہرا اگر میں تمہارے یہاں نہ آتا اور تمہیں نہ دیکھتا تو میری زندگی غیر مکمل رہتی، میری دنیا تاریکیوں میں ڈوبی رہتی۔ تم نے میری زندگی کو حقیقی زندگی بنا دیا ہے۔ کاش ہم آخری سانس تک ایک دوسرے کے ہر دُکھ، ہر مسرت اور ہر غم میں شریک رہیں۔"
وُہ مُسکرانے لگی
"زہرا جب تم نے مجھے پہلی مرتبہ دیکھا تو اپنے دِل میں کیا کیفیت محسوس کی؟" میں نے پوچھا۔
"کیا کیفیت محسوس کی — ! میں ایسی معمولی چیزوں کی طرف توجہ کرنے کی قائل نہیں ہوں۔"
"پھر بھی — تم نے سوچا ہو گا، یہ کون شخص ہے جو اس بے تکلفی کیساتھ

کتابوں کو اُلٹ پلٹ رہا ہے۔ اسے ایسا کرنے کا کیا حق ہے؟"

"ہاں، جبھی تو مَیں نے تمہیں کمرے سے نکال دیا۔"

"اِس کے بعد جب تم نے دیکھا کہ میں بہت اچھا آدمی ہوں تو تم نے خفت محسوس کی ہوگی اپنے دِل میں ــــ ہے نا؟"

"خِفّت؟ ــــ وہ کیوں؟ میں ہر بات سوچ سمجھ کر کہتی ہوں ــــ اس وقت یہی روش موزوں اور مناسب تھی۔ اگر تم میری بجائے ہوتے. تو یہی بات کہتے۔"

"ہرگز نہیں ــــ مَیں ایک محبت کرنے والی ہستی کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہو سکتا، یہ ظالمانہ برتاؤ ہے۔"

"اور اس وقت ہماری حالت ایسی تو نہیں تھی، ہم بالکل اجنبی تھے۔ نہ تم مجھے جانتے تھے نہ میں تمہیں۔"

"اور اب؟"

اور اب؟ ــــ تم نہیں جانتے؟"

"جانتا ہوں مگر آدھی بات۔"

"کیا؟ بتاؤ تو سہی، شاید یہ آدھی بات مکمل بات نکل آئے۔"

"مَیں تمہارا منگیتر ہوں اور تمہیں چا......"

"ہش: جانتے ہو اِس وقت چشمے کے کنارے بیٹھے ہو اور میرے ہاتھ کی دو چار جنبشیں تمہارے کپڑوں کو بھگو سکتی ہیں۔"

"جب ہمارے دلوں میں محبت موجزن ہے — جب ہم عنقریب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو جائینگے تو پھر اظہارِ حقیقت سے گریز"؟

اس نے اپنی لانبی پلکیں اٹھائیں، اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں مجھے عجیب انداز سے دیکھ رہی تھیں۔

"زہرا! اگر مَیں پھر بیمار ہو جاؤں — اور اتنا بیمار ہو جاؤں کہ ہر شخص کو میری زندگی کے منقطع ہو جانے کا یقین ہو جائے — اس وقت تم کیا کرو گی"؟

جس طرح شفّاف چشمے کی سطح پر پتھر گرنے سے ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں ایک اضطراب سا پیدا ہوا۔ اور اس نے چھینٹیں اُڑا کر میرا چہرہ بھگو دیا۔ "ایسے الفاظ منہ سے نہ نکالا کرو" اب تم کبھی بھی بیمار نہیں ہو سکتے"۔

"کبھی بیمار نہیں ہوں گا — یقیناً ایسا ہو گا — پھر بھی"؟

"پھر بھی! — ایسے منحوس الفاظ کیوں نکالتے ہو زبان سے؟ — تمہاری صحت اس چشمے کی مانند ہے۔ دیکھو! کتنا صاف شفاف اور پاکیزہ ہے۔ نہ سطح پر کوئی کثافت ہے اور نہ گہرائی میں۔"

"ممکن ہے ہماری نگاہ گہرائی کا جائزہ نہ لے سکتی ہو، گہرائی میں ریت کیا کنکر موجود ہوں۔"

یہ الفاظ اس وقت میں نے غیر ارادی طور پر کہہ دیئے تھے، اب سوچتا ہوں تو دل کو افسوس ہوتا ہے کہ ایسے واہیات الفاظ کیوں زبان سے نکالے خواہ مخواہ اپنی محبوبہ کا دل دُکھایا، وہ دل میں کیا کہتی ہو گی؟ کیا سمجھتی ہو گی؟

۳۰۔ جون ——————————!

کئی دن سے ڈائری میں کچھ نہیں لکھا۔ کچھ لکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ سیر و سیاحت کے سوا اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ زہرا، ماموں جان اور ممانی کو یقین ہو گیا ہے کہ اب میرے جسم میں بیماری کا نام و نشان بھی نہیں۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ بیماری کے جراثیم ابھی تک میرے جسم کے اندر موجود ہیں۔ اگر یہ بات نہیں تو کیوں شام کے چھ بجے بدن گرم ہو جاتا ہے، کیوں کھانسی آنے لگتی ہے، کیوں کچھ فاصلہ طے کرتا ہوں تو تھک جاتا ہوں؟

۷۔ جولائی

دو دن سے بستر پڑا ہوں۔ چلنے پھرنے کو بہت جی چاہتا ہے، مگر اٹھ کر چند قدم چلوں تو تھک جاتا ہوں۔ یکایک یہ میری کیا حالت ہو گئی ہے؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز ـــ کوئی خوفناک چیز میرے جسم کے اندر داخل ہو کر میری رگوں کا خون چوس رہی ہے، صحت گرتی جا رہی ہے۔

۲۵۔ جولائی

اب ان لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ بیماری نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ سمجھ چکے تھے کہ مجھے صحتِ کاملہ حاصل ہو چکی ہے۔ فہمِ انسانی بھی کتنی جلد فریب کھا کر ظاہری حالت پر مطمئن ہو جاتی ہے۔ اوروں کا تو کیا ذکر، میرا اندازہ بھی یہ تھا کہ اب کوئی خطرہ باقی نہیں، دوسرے صحت مند لوگوں کی مانند میری رگوں میں بھی صالح خون دوڑ رہا ہے، میرا ہر عضو بھی مستعدِ کار ہے، اور میرا جسمانی نظام بھی صحیح کام کر رہا ہے ـــ مگر اب ـــ آہ! اب معلوم ہوا کہ میں خود کو دھوکا دے رہا تھا۔ میرے عزیز بھی خود کو دھوکا دے رہے تھے۔

۳۔ اگست

پرسوں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔ صحتِ کاملہ کی امید لے کر آیا تھا

مگر بدتر حالت لے کر چلا ہوں۔ زہرا تسلی دیتی رہتی ہے کہ معمولی بخار ہے، چند دن تک صحتیاب ہو جاؤ گے۔ ماموں جان کہتے ہیں تم پاگل ہو۔ لاہور میں رات کے دو دو بجے تک پڑھتے رہے، مانا تمہارا ارادہ بہت بلند تھا، تم دُنیا میں اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کرنا چاہتے تھے، مگر صحت کا بھی خیال رکھا ہوتا —— صحت ہی دُنیا میں سب کچھ ہے۔"

یہ الفاظ سن کر پچھتاتا ہوں کہ کیوں صحت کی طرف سے بے پروائی کی، مگر میں کیا کرتا؟ اس بدنصیب غلام ملک میں تعلیم یافتہ مگر غریب نوجوانوں کے لئے ملازمت حاصل کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وُہ یہ کہ انسان مقابلہ کے امتحان میں شریک ہو کر کوئی شاندار پوزیشن حاصل کرے یا ایم۔اے میں اوّل رہ کر کسی کالج میں پروفیسر بن جائے۔ ایسی حالت میں دن رات نہ پڑھتا رہتا تو اَور کیا کرتا؟ چنانچہ ہر امتحان میں اوّل رہا، بی۔اے میں بھی امتیازی درجہ حاصل کیا۔ اَور اس کا نتیجہ؟ —— میرے اللہ! میری آرزوؤں پر رحم کر!

۲۹۔ اگست ——————!

آج اباجی اَور امّی جان دونوں آگئے ہیں۔ دونوں کٹی لمحے مجھے اس طرح

دیکھتے رہے گویا اپنے شہاب کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں — آہ!
ان بے چاروں کو ان کا اپنا صحت مند شہاب اس خستہ، کمزور اور نحیف و نزار جسم میں کیونکر نظر آ سکتا تھا؟

امی آنسو ضبط کر کے بولیں — "میرے لال! تجھے یہ کیا ہو گیا۔ اتنا سا منہ یہ سوکھا ہوا جسم — کس کی نظر تجھے کھا گئی؟"

یہ الفاظ کہتے وقت ان کے دل کی کیا حالت ہو گی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر رو نہ سکا، دل کا طوفان دل ہی میں رہا۔

۲۲-ستمبر —————— !

ایک مبہم خوف کے پنجے میری روح میں اترتے جا رہے ہیں۔ دل بری طرح دھڑک رہا ہے۔ سینے میں ایک زہریلا مادہ بکھرتا پھیلتا چلا جا رہا ہے اور کھانسی سے جسم کی ہڈیاں آپس میں اس طرح ٹکراتی ہیں۔ کہ معلوم ہوتا ہے ابھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی۔

قریب کی کوٹھی سے قہقہوں کی آواز آ رہی ہے۔ کتنے سریلے ہیں یہ قہقہے، کتنی مسرور ہیں یہ آوازیں، میرے آقا! کیا میں ان قہقہوں سے محروم کر دیا گیا ہوں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ دنیا میں ہر شخص کو ہنسنے کا حق حاصل ہے، ہر شخص حرکت کر سکتا

ہے، ہر شخص محبت کر سکتا ہے۔ مگر میں —— میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ نہ اُٹھنے کی طاقت نہ بیٹھنے کی ہمت۔ بستر پہ پڑا تڑپ رہا ہوں۔ سانس ہے کہ بمشکل آتا ہے اور کھانسی ہے کہ دم بھر کے لئے بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کاش میرے دماغ، میرے دل اور میری رُوح کے ساتھ یہ تمام امیدیں، یہ تمام آرزوئیں، یہ تمام ارمان اندھیرے میں تحلیل ہو جائیں۔ بستر پہ اس طرح پڑے رہنا —— ہر وقت پڑے رہنا، آہ یہ مصیبت میں برداشت نہیں کر سکتا۔

۹۔ اکتوبر ——————————!

ڈاکٹر دن میں دو مرتبہ آتا ہے۔ طرح طرح کے آلات سے چھاتی ٹھونک بجا کر چلا جاتا ہے۔ اور اُس کے جانے کے کچھ دیر بعد الماری کی شیشیوں میں دو تین شیشیوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں جانتا تھا ماموں جان میری بیماری پر خرچ کر رہے ہیں۔ مگر اب ایک اور انقلاب دیکھا۔ کل گھر سے منی آرڈر آیا تھا۔ بے چارے اباجان نے کچھ روپیہ مکان خریدنے کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ یہ روپیہ کس طرح لٹایا جا رہا ہے۔

۱۲۔ اکتوبر ——————————!

ڈاکٹر تسلی دیتا ہے چند دن تک صحت حاصل ہو جائے گی اور اِدھر میرا

کیا حال ہے جسم کے اندر بیشمار جونکیں خون چوس رہی ہیں۔ کھالنسی کے حملوں سے ہڈیاں پگھل رہی ہیں اور کھانستے کھانستے سانس رک جاتا ہے۔

۱۷۔ اکتوبر

!

باغ میں مالن کا ایک ننھا بچہ ایک ننھی سی تیتری کے پیچھے ہاتھ پھیلائے بھاگ رہا تھا۔ مجھے بہت پیارا لگا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ ابھی میرے پاس پہنچا ہی تھا کہ مالن بھاگ کر آئی اور اسے اٹھا کر لے گئی۔ جاتے ہوئے کہہ گئی۔ "بابو جی! یہ تنگ کریگا آپ کو۔ رہنے دو —— آرام آ جائے تو اٹھائے پھرنا ——"

میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ میرے جسم میں موت کے جراثیم پھیلے ہوئے ہیں۔ لوگ کیوں نہ نفرت کریں؟ اور کیوں نہ مجھ سے بھاگیں۔ میرے برتن علیحدہ ہیں۔ بستر مخصوص ہے۔

الٰہی میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ زہرا بھی —— دور رہتی ہے۔

۱۹۔ اکتوبر

!

آج زہرا پاس سے گزری تو میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس نے میری طرف دیکھا اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ اس کی ماں اسے باہر

لے گئی۔

جگر تحلیل ہو رہا ہے، پھیپھڑے چھلنی ہو گئے ہیں، گوشت گل سڑ رہا ہے۔ آہ جب ہماری مہربان قدرت انسانی ارادوں کو خاکِ نامرادی میں ملانے پہ تل جائے تو وہ بالکل اندھی ہو جاتی ہے، اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ میں نے کیا کچھ نہیں کیا — میرے لئے کیا کچھ نہیں کیا گیا — ڈاکٹروں پہ بارش کی طرح دولت نچھاور کی گئی، کڑوی کسیلی دوائیوں کی تو نہیں میرے حلق میں انڈیل دی گئیں۔ یہی نہیں، میں نے رو رو کر پیدا کرنے والے کی درگاہ میں دُعا کی۔ گڑگڑایا — چیخا — پکارا مگر بے سود، جسم میں دھنسی ہوئی بوجھل زنجیریں اَور بوجھل ہو گئیں۔

جی چاہتا ہے، ان بوجھل زنجیروں کو — اِن ہڈیوں میں سوراخ کرنے والے جراثیم کو کچل کر پیس کر خاک میں ملا دوں۔ پھر کھلی فضا میں، ٹھنڈی ہوا میں آزادی کے سانس لوں، آزادی کے ساتھ ہنسوں، آزادی کے ساتھ چلوں پھروں — یہ بوجھل زنجیریں، یہ جراثیم، اف میرے اللہ میرا دم گھٹا جاتا ہے۔

باہر بارش ہو رہی ہے اَور میں اکیلا پڑا ہوں، ماں بیٹھے بیٹھے سو گئی ہے

اباجان پائینتی کی طرف لیٹے ہیں۔ بادل گرجتا ہے تو بمشکل پہلو بدل لیتا ہوں، اور کیا کروں؟ یہ سطریں گھسیٹ رہا ہوں کہ چند منٹ تو گزر جائیں گے۔ صبح ہو گی۔ سورج نکلے گا، ٹھنڈی ہوا چلے گی، زندگی کے آثار پیدا ہوں گے۔

کھانسی آتی ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ چھاتی پر پتھر مارے جا رہے ہیں۔

میں اپنی زہرا کو آنسو بہاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ کاش! اس گلے سڑے جسم کے اندر یہ سرسراتی ہوئی چیز ہمیشہ کے لئے ساکن ہو جائے۔

میں صحن میں لیٹا تھا، ایک سفید کبوتر ڈربے کے پاس پہنچا اور ابھی اس نے اپنا منہ کٹورے میں ڈالا ہی تھا کہ سامنے سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بلّی آئی اور اس بدنصیب ہستی کو اپنے منہ میں دبا کر آناً فاناً غائب ہو گئی۔ یہ واقعہ کوئی نیا واقعہ نہیں، ہر گھر میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے اور ہماری نگاہوں کے سامنے ہوتا رہتا ہے۔ مگر کون اس طرف توجہ کرتا ہے۔ اس وسیع کائنات میں ہماری حیثیت ہی کیا ہے، کس کو خبر ہے کہ بیچارے کبوتر کے ننھے سے سینے میں کتنے ارمان تڑپ رہے تھے، اسے اپنے گھونسلے میں پہنچکر اپنے بچوں سے ملنے کی

کتنی تمنا تھی، اسے اپنے ساتھیوں سے مل کر بپیہے کی طرح فضا میں اُڑنے کا کتنا اشتیاق تھا ۔۔۔ مگر ایک ظالم ہستی اس پر جھپٹ کر اس کے نرم نرم گوشت کو اپنے تیز دانتوں میں دبا کر بھاگ گئی تا کہ اس کے گوشت، اس کی ہڈیوں سے اپنے جسم کی پرورش کرے ۔ آہ! اِسی طرح ہر صبح، ہر شام انسانی تمناؤں کو کچلا جا رہا ہے، انسانی دل و دماغ کو خاک میں ملایا جا رہا ہے ۔ اور یہ کچلنے والی ہستی ۔۔۔ یہ خاک میں ملانیوالی ہستی کون ہے ؟ قدرت ! ۔۔۔ ہماری مہربان قدرت !! ۔۔۔ یہ قدرت کا نظام ہے کہ باپ اپنی پیاری اولاد سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاتا ہے ۔۔۔ ماں اپنے بچوں کو بلکتے ہوئے چھوڑ کر چلی جاتی ہے ۔۔۔ بیٹا والدین کے پُر امید دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے موت کی نیند سو جاتا ہے، محبوبہ اپنے محب کو تڑپتا ہوُا چھوڑ کر راہیٔ ملکِ عدم ہو جاتی ہے اور محب اپنی محبوبہ کے نازک آئینہ دل کو پاش پاش کر کے دوسری دنیا کو سدھار جاتا ہے ۔ کیا قدرت ان روح فرسا مناظر کو نہیں دیکھتی ؟ ۔۔۔ ان خاکِ نامرادی میں تڑپتے ہوئے ارمانوں پر نگاہ نہیں ڈالتی ؟ ۔۔۔ اِن خون میں نہائی ہوئی تمناؤں کا خیال نہیں کرتی ؟ ۔۔۔ وُہ سب کچھ دیکھتی ہے، سب کچھ جانتی ہے، مگر ستم یہ ہے کہ اسے اس طرح جاندار ہستیوں کو کچلنے میں لطف آتا ہے ۔ وہ مرتے ہوئے انسان کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے

وہ سسکتی ہوئی ہستی پر نظر ڈال کر قہقہے لگاتی ہے، وہ مٹتے ہوئے ارمانوں، تڑپتی ہوئی تمناؤں، سسکتی ہوئی آرزوؤں کا خوش ہو ہو کر تماشا دیکھتی ہے۔ پھر بھی قدرت مہربان ہے؟ اگر قدرت مہربان ہے تو پھر وہ بلّی بھی مہربان ہے جو اپنے شکار سے کھیلتی ہے، تاکہ اسے ایک دم نگل جائے ـــــ وہ شیر بھی مہربان ہے جو جھاڑی کے پیچھے اس لئے چھپا ہے کہ جیسے ہی ہرن آئے، اس پر کود پڑے اور اس کی گردن پر ہمنہ رکھ کر اس کا تمام خون پی جائے ـــــ وہ بھیڑیا بھی مہربان ہے جو ایک معصوم بکری کے پیٹ پر پنجہ رکھ کر اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔

دریا میں طغیانی آتی ہے اور گاؤں کے گاؤں چند لمحوں میں تباہ ہو جاتے ہیں۔ زلزلہ آتا ہے اور ایک متمدن شہر چشم زدن میں لق و دق صحرا بن جاتا ہے۔ آتش فشاں پہاڑ آتش فشانی کرتا ہے۔ اور اس کے دامن میں رہنے والے بے گناہ باشندوں کے جسم گوشت کے لوتھڑے بن کر فضا میں اُڑنے لگتے ہیں ہری ہری کھیتی لہلہاتی ہے کہ آسمان سے بجلی گر کر اسے جلا کر راکھ کر دیتی ہے شاخوں پر پھول شگفتہ ہوتے ہیں کہ خزاں آتی ہے اور تمام باغ اُجڑ کر جنگل بن جاتا ہے۔ معصوم پرندے ہوا میں محو پرواز ہوتے ہیں کہ شاہین آتا ہے اور اُن پر جھپٹ کر ان کی بوٹی بوٹی کر کے کھا جاتا ہے۔

یہ کیا نظام ہے قدرت کا؟ کاش میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت آ جائے کہ میں اس ظالم نظام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں —— اس بربریت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دوں —— اس وحشیانہ پن کو ہمیشہ کی نیند سلا دوں —— اس ظلم کو جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دوں —— اس ستم کو موت کے تاریک غار میں دھکیل دُوں۔ اور پھر ایک نئی دنیا بنے —— نیا آسمان ہو، نئی زمین ہو جہاں کسی قسم کا ظلم نہ ہو —— کسی قسم کی وحشت نظر نہ آئے —— کسی قسم کی بربریت دکھائی نہ دے۔

ابنِ آدم دُکھی ہے —— سخت دُکھی ہے! اسے ہر جگہ پیسا جا رہا ہے! کبھی کسی رنگ میں اور کبھی کسی انداز میں اور قدرت آسمان کے کسی گوشے میں بیٹھی اپنے محبوب کارنامے دیکھ دیکھ کر ہنس رہی ہے —— قہقہے پر قہقہہ لگا رہی ہے۔

اے کاش! یہ موجودہ نظام ایک پھول بن جائے اور میں اس پھول کو مسل ڈالوں —— اِس طرح مسل ڈالوں کہ اس کا حقیر سا جزو بھی باقی نہ رہے۔ اے کاش! اے کاش!!

معلوم ہوتا ہے آج میرا دل پھٹ جائیگا —— سینے کی ہڈیاں چکنا چُور

ہو جائیں گی، ہر عضو پاش پاش ہو جائے گا۔ جو کچھ ہونا ہے جلدی ہو جائے۔

زندگی ایک تاریک رات بن گئی ہے۔ سینے میں طوفان اٹھتا ہے، رو لیتا ہوں۔ اِن لوگوں کی آنکھوں میں یہ کیا چیز چمکتی رہتی ہے؟ کیا مجھ سے مایوس ہو چکے ہیں ہے؟

دُنیا تاریک ہے۔ شاید رات آ گئی ہے۔ دن کی روشنی کب آئیگی؟

اندھیری رات ـــــ اندھیرے میں وُہ آہستہ آہستہ آ رہی ہے بھاگ جاؤں؟ کہیں بہت دُور ـــ!

...... وُہ آ رہی ہے ـــ اندھیرے میں آہستہ آہستہ!......

نالۂ دِل

آج کا دن بھی کل کے دن کی طرح بیت گیا۔ نہ کل کے دن میں کوئی خصوصیت تھی اور نہ آج کے دن کو کوئی امتیازی شان حاصل ہے۔ آزاد ملکوں کیلئے زندگی کا ہر دن بذاتِ خود ایک نئی زندگی ہے، مگر غلام قوموں کے لئے تمام زندگی ہی ایک خوابِ پریشاں بن کر رہ جاتی ہے۔ آزاد باشندے زندہ ہیں، کیونکہ انہیں زندہ رہنے کا حق ہے۔ لیکن غلام باشندے نہ زندہ ہیں اور نہ مُردہ۔ آزاد دل و دماغ اپنی قسمت کے آپ معمار ہیں۔ زندگی کا ہر حادثہ، ہر واقعہ اُن کی مرضی کے مطابق رُونما ہوتا ہے۔ مگر غلامی کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی روحیں زندگی کے سیلاب میں حقیر تنکوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں یورپ کے لوگ جب صبح بیدار ہوتے ہیں تو تمام دن کا پروگرام اُنکی

نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ سیر وقت پر، کھانا وقت پر، تفریح وقت پر، الغرض اُن کا ہر قول، ہر فعل اپنے پروگرام کے مطابق صحیح وقت پر بروئے کار آتا ہے۔

مگر ہمارے بدنصیب ملک میں "ایک مجبوری" ہی ایسی چیز ہے جو پوری باقاعدگی کے ساتھ ہماری زندگی کے ہر لمحے پر چھائی ہوئی ہے۔ اگر میں ایک آزاد ملک کا باشندہ ہوتا تو دِن بھر کے واقعات کا غور و خوض کے ساتھ جائزہ لیتا۔ پروگرام کے ہر حصّے، ہر گوشے کا سختی کے ساتھ محاسبہ کرتا۔ دیکھتا کہ کسی جگہ بے قاعدگی کا گمان تو نہیں ہو سکتا۔ کوئی واقعہ ایسا تو نہیں جو میرے لئے سوسائٹی کے لئے زیادہ سُود مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ سوچ بچار، یہ غور و فکر مجھ پہ عمل کے نئے نئے دروازے کھول دیتی۔ میرا ذہن نئی نئی کامرانیوں کے ذرائع کا احاطہ کر لیتا اور میرا دماغ نئی نئی فتوحاتِ حیات کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

مگر اب کیا ہے ——————؟

ایک تاریک کوٹھی میں پڑا ہوں، جہاں زندگی کی ہلکی سی روشنی بھی نہیں آ سکتی۔ جہاں مسرت کی حقیر سی کرن بھی نہیں پہنچ سکتی۔

آج کا دِن بھی بیت گیا، اپنی تمام افسردگی، اپنی تمام مُردہ دلی کے ساتھ

بیت گیا ـــــــ بیت گیا سینے میں ناکامیوں کے چند نقوش چھوڑ کر، یہ نقوش بھی مٹ جائیں گے۔ غلام زندگی کے لئے ناکامی کوئی نئی چیز نہیں!

صبح بستر سے اُٹھ کر سوچتا تھا، یہ کرونگا، وُہ کرونگا۔ رات کو بستر پر لیٹتے وقت افسوس کرتا ہوں، نہ یہ کیا، نہ وُہ کیا ـــــ آہ میری ناکام زندگی آہ میری مجبوری، میری بیچارگی!!

جب کبھی یورپ کے کسی اخبار پر نظر ڈالتا ہوں تو دل سے کہتا ہوں زندگی اسقدر قیمتی ہے کہ اس کی قیمت کا اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا اور جب کبھی اپنے معمولاتِ حیات کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں، یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ ایک ناقابلِ برداشت بارگراں ـــــ جتنی جلدی ہو سکے، اسے پھینک دینا چاہیئے۔

لوگ موت کے نام سے بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں، مرنے کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں آخر ہماری اس زندگی ہی میں کونسی روشنی ہے جو دوسری دُنیا کے اندھیرے سے ڈریں۔ ممکن ہے، قبر میں تاریکی ہو، قبر کے بعد بھی تاریکی ہو۔ لیکن یہ دونوں تاریکیاں غلامانہ زندگی سے بھیانک نہیں ہو سکتیں! غلامانہ زندگی لعنتوں کے تعفّن سے بھری ہوئی کثیف تاریکی ـــ

دُنیا کی کونسی مکروہ رُوح اپنے آپ کو اس کے حوالے کر سکتی ہے؟

آج کا دن بھی بیت گیا ــــ زندگی کے درخت کی ایک اور شاخ ٹوٹ گئی۔ حیاتِ چند روزہ کے پیالے میں سے ایک اَور قطرہ گرا اور ماضی کی خاک میں مل گیا۔

زندگی آرزوؤں کا نام ہے ــــ سینے کی گہرائیوں میں یہ چراغ روشن ہوں تو وقت کا ہر لمحہ فرطِ روشنی سے جگمگ جگمگ کرنے لگتا ہے اور یہ چراغ بجھ جائیں تو زندگی ایک کھنڈر ہے ــــ ایک سنسان صحرا ہے ــــ ایک ٹوٹی پھوٹی قبر ہے۔ میں سینے کے اندر جھانک کر دیکھتا ہوں تو تمناؤں کی ٹھنڈی خاکستر میں صرف ایک حقیر سی چنگاری نظر آتی ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ حقیر سی چنگاری کبھی ایک آتشیں شعلے میں تبدیل ہو جائے؟

آج کا دن بھی بیت گیا ــــ آج کے دِن کے بارہ گھنٹے بھی گزر گئے، اب رات آئی ہے، اس کے بعد پھر دن آئے گا ــــ پھر وُہی مجبوری ہو گی ــــ ہر کام میں مجبوری ــــ گویا سر پر ایک بھاری بوجھ اٹھائے بدِقّت تمام چل رہا ہوں۔ جب بہت تھک جاتا ہوں تو کسی جگہ بیٹھ جاتا ہوں ــــ اس طرح یہ تھکاوٹ قدرے دُور ہو جاتی ہے۔ اور مَیں پھر یہ بوجھ اُٹھا کر گامزن ہو جاتا ہوں۔ یہ ہے میری موجودہ زندگی ــــ یہ ہے ایک غلام ملک کے باشندے

کی زندگی۔

آج جمعرات ہے اس لئے ہمارے دفتر میں حسب معمول فقیروں کا ایک جم غفیر آموجود ہوا۔ فرم کے مالک نے دستور کے مطابق داد و دہش کا دروازہ کھول دیا اور ہر فقیر کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں ایک ایک دھیلا گرنے لگا۔ ایک گھنٹہ تک فقیروں نے اتنا شور مچایا کہ فرم کا کوئی ملازم بھی اپنے کام کی طرف توجہ نہ کر سکا، اور اگر ان بدبخت انسانوں کو دھکے دے دے کر نہ نکال دیا جاتا تو نہ معلوم یہ شور و شغب کب تک بپا رہتا!

میرا خیال ہے، اگر کسی ترقی یافتہ ملک کا باشندہ اس شہر میں آئے اور بدقسمتی سے کسی "مزار مقدس" کی زیارت کے لئے چلا جائے۔ تو یقیناً وہ فقیروں کا ہجوم دیکھ کر گھبرا جائے گا اور سب سے پہلا خیال جو اس کے ذہن میں آئیگا، وہ یہ ہوگا کہ یا تو اس شہر کی نصف آبادی گداگروں پر مشتمل ہے اور یا اس شہر میں قحط پڑ گیا ہے اور لوگ غیرت و حمیت کا گلا گھونٹ کر اپنا پیٹ بھرنے کے لئے امیروں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔

گداگروں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے ملک کی معاشرتی اور معیشتی حالت کو

اس قدر نقصان پہنچا رہا ہے کہ اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا ایک تو یہ لوگ خود گداگر، ان کی اولاد گداگر، اور پھر ان کی اولاد کی اولاد گداگر۔ یعنی جو شخص بھی ان گداگروں سے دُور کا تعلق رکھتا ہے، وہ فطرۃً گداگر ہے اور اسے تمام عمر گداگر رہنا چاہیئے۔ یہ لوگ ہمارے اقتصادی نظام کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ تباہ کر رہے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے۔ مگر معاملہ اس حقیقت تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس حقیقت کے ساتھ ایک اور رُوح فرسا حقیقت بھی وابستہ ہے' ان گداگروں کی نوجوان لڑکیاں اور بیویاں ملک اور قوم کے اجتماعی اخلاق کو سخت نقصان پہنچا رہی ہیں۔

یہ گداگر ہیں، انہیں کسی نہ کسی صورت میں پیٹ کی آگ بجھانی ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ طبقہ ہر ذلیل سے ذلیل کام کر سکتا ہے۔ میں روحانیت کا قائل ضرور ہوں، مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب پیٹ خالی ہو تو نہ معلوم کیوں دماغ عقل سے، اور دِل پاکیزہ جذبات سے خالی ہو جاتا ہے؛ اور پھر ان عورتوں نے تو دودھ ہی اُن ماؤں کا پیا ہے، جو نیکی اور بدی میں تمیز ہی نہیں کر سکتیں، جو جانتیں ہی نہیں کہ دُنیا میں اخلاقی بلندی بھی کوئی چیز ہے۔

آپ کہتے ہیں یہ گداگر لوگ سخت بے حیا، سخت بے شرم ہیں۔ ان کے دلوں پر غیرت کا سایہ تک نہیں پڑا۔ یہ سب کچھ بجا اور درست، مگر میں پوچھتا ہوں کبھی آپ کی "عقلِ رسا" نے اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی بھی کوشش کی ہے؟ کیا یہ گداگری بیکاری کا نتیجہ تو نہیں ـــــ کیا یہ لعنت "مجبوری" ہی کے سائے میں تو نہیں پرورش پاتی ـــــ کیا گداگر پیدا ہوتے ہیں یا بنائے جاتے ہیں؟

آج کل آپ بازار جاتے ہیں تو ہر پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک فقیر ملتا ہے، جو گڑگڑا گڑگڑا کر آپ سے خیرات مانگتا ہے اور اگر ہندوستان کی یہی حالت رہی تو کسی دن آپ کو ہر دو قدم کے فاصلے پر ایک گداگر نظر آئے گا۔ غور کیجئے، اس وقت کیا حالت ہو گی؟

گداگری ـــــ وقت کا ایک نہایت اہم سوال ہے ـــــ مگر شکوہ کیوں کیا جائے۔ کیا کبھی کسی غلام ملک نے وقت کے اہم سوالوں کی طرف بھی توجّہ کی ہے؟

روٹی ـــــ ایک چھوٹا سا لفظ، چار حروف کا ایک ننھّا سا مجموعہ، اور آواز

کی ایک حقیر سی لہر، مگر کونین کی کونسی وسعت ہے جو اس چھوٹے سے لفظ میں موجود نہیں، زندگی کی برکتوں کا کونسا سرچشمہ ہے جو اس ننھے سے مجموعے میں محدود نہیں اور ہماری کوششوں کا کونسا حاصل ہے جو اس حقیر لہر کے دامن میں دکھائی نہیں دیتا؟

مشرق روحانیت کا گہوارہ ہے، روحانی ترقیوں کی سرزمین ہے، مگر مشرق کا کوئی گوشہ ایسا بتایئے جہاں روحانیت روٹی کی احتیاج سے بے نیاز ہے؛ مغرب کو سائنس کا گھر کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ اپنی سائنس کی قوت سے قدرت کو مسخر کر رہا ہے، مگر کیا مغرب میں کوئی کونہ ایسا بھی ہے، جہاں سائنس کی انتہائی ترقیاں روٹی کے سامنے سر جھکانے پر مجبور نہیں؟

یہ سب انسانی کوششیں، یہ حیرت انگیز جد و جہد، یہ تحیر زا تگ و دو، یہ ہولناک جنگ و جدل، یہ خوفناک معرکہ آرائیاں کس لئے ہیں؟ روٹی کے لئے —— روٹی اور صرف روٹی کے لئے!

جمالیاتی ذوق ہر شخص کو گدگداتا ہے، ہر انسان شعر و نغمہ کی مستیوں کا قائل ہے، اور نسل انسانی کا ہر فرد حسن کا ایک اعلیٰ نمونہ دیکھ کر روحانی لذتوں میں بھی غرق ہو جاتا ہے، مگر یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے جب پیٹ روٹی

سے بھرا ہو، اور جب پیٹ روٹی سے محروم ہو اس وقت دنیا کے سب سے بڑے مغنّی کی سحر آور موسیقی اور ہمارے سروں کے اوپر اُڑتی ہوئی مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں کوئی فرق نہیں، کوئی فرق ہو ہی نہیں سکتا۔

آپ ایک بھوکے انسان کو یورپ کی بہترین آرٹ گیلری میں لیجایئے اور اُسے شہرۂ آفاق مصوّروں کے مصوّرانہ معجزوں سے "لطف اندوز" ہونے کا موقعہ دیں، مگر اس کے لئے آرٹ کا یہ کمال بے معنی، لغو اور بیہودہ ہوگا۔ اس کے دل میں صرف ایک خواہش ہوگی، اور وہ خواہش ہوگی روٹی کی۔ اس کے ضمیر اس کے دماغ اور اس کی رُوح سے جو پکار بلند ہوگی وُہ صرف روٹی کی پکار ہوگی۔ جب وہ سیر شکم ہو جائے اس وقت آپ اس کے سامنے ایک معمولی سے مصور کی معمولی سی تصویر بھی رکھدیں جب بھی وُہ لطف حاصل کریگا اور خوب کریگا۔ پیٹ بھرنے کے بعد جو لذت اسے ٹیڑھے ترچھے خطوط دیکھنے میں حاصل ہوتی ہے، وُہ خالی پیٹ "مونالزا" کے معجزانہ کمال میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اسی طرح آپ کسی بھوک سے بیتاب انسان کو شعر و نغمہ کی دُنیا میں لے جایئے وُہ دُنیا کی حسین ترین دوشیزاؤں کے رقص و نغمہ اور ایک مریل کتّے کی بھوں بھوں میں ذرہ بھر امتیاز نہیں کر سکے گا۔

مشرق اپنی رُوحانیت پرستی پر نازاں ہے اور دنیا بھی اس کی رُوحانیت پرستی کی معترف ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ مشرق کے زوال کی سب سے بڑی وجہ یہی روحانیت پرستی ہے۔ ہمارے علمبردارانِ مذہب ہماری توجہ صرف روحانیت کے دائرے میں مقیّد کرنے کی کوشش کرتے رہے اور آج ہم دیکھتے ہیں۔۔ کہ روحانیت کی منزلیں طے کرنیوالے "بزرگوں" کی نسلیں تاریک اور گندی گلیوں میں پڑی سسک رہی ہیں۔ روحانیت کا آفتاب سب سے زیادہ ہندوستان کے آسمان پر چمکا اور آج دنیا میں سب سے زیادہ بھوکے ننگے انسان ہندوستان کی سرزمین پر ہی پڑے سڑ رہے ہیں۔

مجھے یہاں صرف اس انسانی طبقے سے تعلق ہے جو "اہلِ قلم طبقہ" کہلایا جاتا ہے۔ آپ ذرا ایک ادبی مجلس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے لائیے۔ چند آدمی بیٹھے گپیں ہانک رہے ہیں، اتنے میں ایک شخص نمودار ہوتا ہے۔ اس کے سر کے بال کنگھی سے بے نیاز ہیں، چہرے پر نحوست برس رہی ہے۔ یہ شخص محفل میں آکر کچھ دیر تک وحشیانہ حرکتیں کرتا ہے۔ اور پھر ایک گوشے میں بیٹھ جاتا ہے، اہلِ محفل اس کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

"شاعر صاحب! تازہ کلام سنائیے! ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے"۔

اب شاعر صاحب شعر سنائیں گے اور سامعین ہاتھ بڑھا بڑھا کر، بیتاب ہو ہو کر داد دیں گے۔ کوئی کہے گا۔" واہ صاحب! تخیل کی بلند پروازی اسی کو کہتے ہیں۔"

ایک ذرّہ نواز یوں ذرّہ نوازی کریں گے" کیا بات ہے، آسمان کے تارے توڑ لائے ہیں آپ!"

ایک صاحب اس طرح داد دیں گے۔" معاملہ بندی تو آپ پر ختم ہے۔"

اپنی تعریف سُن کر شاعر صاحب کی باچھیں کھل جائیں گی۔ چہرہ فرطِ مسرت سے گلنار ہو جائے گا اور آپکی حرکتوں سے یوں محسوس ہو گا گویا آپ کو کونین کی دَولت مل گئی ہے۔

اس کے بعد شاعر صاحب گھر تشریف لے جائیں گے۔ اور گھر کیا ہے ایک سرائے ہے۔ چارپائی ہے تو ٹوٹی ہوئی، میلے کچیلے کپڑے ہیں تو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے اور شاعر صاحب کے بچے ہیں تو اچھی خوراک نہ ملنے کی وجہ سے کمزور اور نڈھال۔

بیوی پوچھے گی۔" کچھ کما کر لائے؟"

شاعر صاحب فرمائیں گے" بس بس مجھے پریشان نہ کرو۔ لوگ مجھے

سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور تم ہو کہ ـــــ کہ ـــــ میں حیران ہوں کہ تم ایک جلیل القدر شاعر کی بیوی ہو کر شاعرانہ لطافتوں سے اس قدر محروم کیوں ہو؟"

یہ ہے ہمارے اہلِ قلم کا حال ـــــ یہ لوگ آسمان کے تارے توڑتے ہیں تخیّل کی بلندیوں پر پرواز کرتے ہیں، ان کا تخیل فرش سے لے کر عرش تک ہر چیز کو محیط ہے۔ مگر ان کی بیویاں، ان کے بچے ـــــ آہ! ان بچاروں کا کیا حال ہے؟ خدا کی پناہ! اگر آپ کو دُنیا میں دوزخ کا نقشہ دیکھنا ہو تو کسی روحانیت پرست اہلِ قلم کے گھر تشریف لے جائیں۔ یہ بدنصیب انسان، جس کا ذہن دن رات زندگی اور کائنات کے حقائق کی وادیوں میں سرگرداں رہتا ہے، اپنی تمام جگرکاویوں کے باوجود دو روٹیوں کو بھی محتاج ہے۔

آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے بزرگ کئی صدیوں تک روحانیت کے سب سے اُونچے کنگرے پر چڑھ کر اپنے پھیپھڑوں کا تمام زور لگا کر پکارتے رہے کہ اہلِ قلم تخیّل کی دنیا میں رہتے ہیں، ان کو مادی دنیا سے کیا کام؟ گویا اہلِ قلم کا پیٹ گندم کی روٹی کی بجائے چاند اور ستاروں کی لطیف و شاداب روشنی سے بھرتا ہے اور اہلِ قلم کو اپنا تن ڈھانکنے کے لئے کپڑوں کی نہیں چودھویں رات

کے چاند کی ٹھنڈی کرنوں کی ضرورت ہے ـــــ اس بیہودہ، خطرناک اور لغو نظریے نے ہمارے اہلِ قلم کو تباہ کر دیا ہے ـــــ

دوسری وجہ یہ ہے کہ جمہور بھی اہل قلم کو مادی ضرورتوں سے یکسر بے نیاز سمجھتے ہیں۔ کتنے تعجب کا مقام ہے کہ کتابیں بیچنے والے تو رئیسانہ زندگی بسر کریں اور کتابیں لکھنے والے متعفن گلیوں میں فاقوں مریں۔

آج ہمارے ادب کا نصف سے زاید حصّہ پریشاں دماغوں کی پریشاں خیالیوں کا مجموعہ ہے۔ کیوں ـــــ؟

صرف اس لئے کہ جو شخص بھی قلم ہاتھ میں لیتا ہے وہ سمجھ لیتا ہے کہ اب روٹی کمانے کے ذرائع اختیار کرنا دنیاداری ہے اور دنیاداری کو شعر و تخیل سے کوئی تعلق نہیں ـــ دوسرے سوسائٹی بھی سمجھتی ہے کہ یہ اہلِ قلم ہے، اِسے تخیل کی وادیوں کی سیر کرنی چاہیئے ـــــ مادی کثافتوں سے اسے کیا کام؟

اب سوال یہ ہے کہ اہل قلم کا پیٹ بھی ہے ہے بچے بھی ہیں، ان بچوں کی ماں بھی ہے، اِن سب کے لئے روٹی آئے تو کہاں سے آئے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک پورا کنبہ غربت اور بیکسی کا شکار ہو جاتا ہے!

کئی صدیوں سے اہلِ قلم اس ذلیل اور خطرناک نظریئے کی چکّی میں پِستے

جا رہے ہیں۔ مگر اب وقت آگیا ہے کہ لکھنے والوں کی آنکھیں کھلیں اور وُہ اپنے چھینے ہوئے حقوق کو حاصل کریں!

دُنیا کبھی بھی کسی موثر جد و جہد کے بغیر کسی کے جائز حقوق کا اعتراف نہیں کرتی۔ اس لئے اپنے حقوق منوانے کے لئے، اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے صُرف موثر جد و جہد ہی پہلا اور آخری کامیاب حربہ ہے!

دیکھنے والے نہ دیکھیں تو یہ اور بات ہے، ورنہ ناکامی اور مفلسی کی آگ سے جلتے ہوئے دلوں اور دماغوں میں جو خیالات پیدا ہو رہے ہیں وہ پرورش پانے کے بعد ایک نہ دِن انقلاب کے آہنی بازو بن کر سوسائٹی کے ظالم قوانین کو چُور چُور کر دیں گے۔

اِس وقت ہر وُہ شخص، جس کا خون چوسا جا رہا ہے، ظالم سوسائٹی سے چوسے ہوئے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب مانگے گا!

آدم کی اولاد، اس کرّۂ ارض پر ہزاروں اور لاکھوں گروہوں میں تقسیم ہو کر زندگی بسر کر رہی ہے۔ قومی تصورات، مذہبی معتقدات، جغرافیائی حدود لسانی مغائرت اور اس قسم کے بیشمار بنیادی اختلافات ہیں، جنہوں نے انسانوں

اور انسانوں کے درمیان آہنی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہر معمولی سے معمولی خاندان، ہر چھوٹے سے چھوٹے قبیلے، اور ہر مختصر سے مختصر گروہ کے افراد بھی کسی نہ کسی بات پر، کسی نہ کسی رنگ میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ کوئی دولتمند ہے تو کوئی غربت کے شکنجے میں جکڑا ہوا، کوئی ذی شعور ہے تو کوئی عقل و خرد سے محروم، کوئی صاحب عزت ہے، تو کوئی حقیر و ذلیل، اور کوئی طاقتور ہے، تو کوئی کمزور و بیکس، مگر میں نے جب کبھی غور کیا ہے تو مجھے افرادِ نسل انسانی صرف دو گروہوں میں منقسم نظر آتے ہیں:۔

ایک گروہ ہے ظالموں کا اور دوسرا مظلوموں کا ۔۔۔!

ظالم ظلم کرتا ہے، کیونکہ وہ ظلم کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور اِس طاقت کو استعمال کرنا بھی جانتا ہے۔ مظلوم ظلم سہتا ہے، کیونکہ اس میں نہ تو ظلم کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہے اور نہ مظلومیت کے دائرے سے باہر نکلنے کی جرأت!

ظالم مظلوم کی ہر کمزوری سے واقف ہے، اِس لئے وہ اُس کی ہر کمزوری سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ مظلوم ظلم کی ہر طاقت سے مرعوب ہے، اس لئے وہ ہر طاقت کے آگے سر جھکانے پر مجبور ۔۔۔!

ظالم کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وُہ مظلوم کی بصارت و بصیرت پر بجلیاں گراتا رہے، اس کے ذہن پر نت نئے ہتھیاروں سے کام لے کر خوف و دہشت پھیلاتا رہے۔ تاکہ مظلوم حالات کا جائزہ لینے کا حوصلہ ہی نہ کر سکے اپنی پوشیدہ طاقتوں کو سمجھنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

مظلوم اپنی بہتری اسی میں سمجھتا ہے کہ زندگی کے آخری سانس تک کولھو کا بیل بنا رہے، اور اپنے آپ کو ظالم کے رحم و کرم کے حوالے کر دے۔

ظالم ہر مکر کا پانسہ پھینک کر مظلوم کا سب کچھ چھین لیتا ہے اور مظلوم آہستہ آہستہ اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وُہ زندہ نہ رہ سکے گا ـــــ!

آپ اس وسیع دُنیا کے کسی گوشے، کسی حصے میں چلے جائیں آپ کو یہی دو قسم کے انسان نظر آئیں گے۔ ایک تو وہ ہوگا جسے ہر چیز پر اختیار ہوگا اور دوسرا وُہ ہوگا جو اپنی ذات کی ملکیت سے بھی محروم ہے۔

ظالم کہیں تو تاج و تخت کے وارث کی صورت میں نظر آئے گا، اور کہیں کسی فرم کے مالک کی شکل میں۔ مظلوم کبھی تو رعیت کے ایک فرد کی حیثیت میں دکھائی دیگا اور کبھی ایک مزدور کے روپ میں، نہ ظالم کے لئے کوئی جگہ

مخصوص ہے اور نہ مظلوم کے لئے کوئی گوشۂ ارضِ معیّن!

ظالم وُہ ہے جو مظلوم کی تمام صلاحیتوں کو چھین کر، اسے زندگی کی روشنی اور بلندی کی طرف بڑھنے نہیں دیتا۔ مظلوم وُہ ہے جو ترقی کرنے کی تمام صلاحیتیں رکھنے کے باوجود، ظالم کو اپنے راستے میں حائل دیکھ کر، قدم آگے اٹھانے کی بجائے ایک ہی جگہ جم کر کھڑا ہو جاتا ہے — یا خوف و دہشت سے رجعتِ قہقری کرنے لگتا ہے۔

انسانی زندگی آگے بڑھنے — ہر لمحہ آگے بڑھنے کا نام ہے۔ جو شخص بھی اسے آگے بڑھنے سے روکے وُہ ظالم ہے، اور جو زندگی بھی آگے بڑھنے سے رُک جائے وُہ مظلوم ہے۔

ایک فرم کا مالک سرمایہ دار ہے، اسے فرم چلانے کے لئے، نفع حاصل کرنے کے لئے مزدوروں کی ضرورت ہے جو اس کے یہاں حقیر سی تنخواہوں پر رات دن کام کریں، اب سرمایہ دار کی انتہائی خواہش اور انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ مزدور زندگی کے آخری سانس تک مزدور رہیں۔ کیونکہ اگر مزدور، مزدورانہ حیثیت سے ترقی کر جائیں تو لازماً فرم کے مالک کو نقصان پہنچے گا۔

اور دیکھئے —!

سرمایہ دار کا بیٹا سرمایہ دار ہو گا اور مزدور کی اولاد مزدور۔ سرمایہ دار کا بیٹا اپنے باپ سے بھی بڑھ کر سرمایہ دار ہو گا۔ اُسے زندگی کی ہر نعمت میسر ہے اسے ترقی کرنے کا ہر ذریعہ حاصل ہے۔ اس کے برخلاف مزدور کا بیٹا اپنے باپ سے بھی زیادہ غریب اور مفلس ہو گا۔ ایک تو مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہونیکی وجہ سے اسے اُجرت کم ملیگی۔ دوسرے اسے محنت بھی زیادہ کرنی پڑے گی۔

اب خود ہی سوچ لیجئے ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟

ایک اور منظر دیکھئے:۔

آپ اپنے مکان کے صحن میں بیٹھے ہیں، سامنے سڑک پر ایک نحیف و نزار بوڑھا خاکروب جھاڑو دے رہا ہے، اس کے پیچھے اس کا بیٹا بھی باپ کا کام کر رہا ہے۔ بیٹے کے اِردگرد بیٹے کے اپنے چھوٹے چھوٹے بیٹے ٹین کے ایک ٹکڑے سے سڑک پر جمے ہوئے گوبر کو کھُرچ رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ باپ خاکروب، بیٹا خاکروب، اور پھر بیٹے کے بیٹے بھی خاکروب، اور پھر بیٹوں کے بیٹے بھی یہی کام کریں گے۔

کیا یہ ظلم نہیں کہ نسلِ انسانی کے ایک حِصّے کی زندگی جھاڑو ہی کے گرد گھومتی رہے ——— جھاڑو چھوڑ کر انسانی ترقی کے کسی دروازے کی

طرف رُخ ہی نہ کرے۔

اگر کوئی خاکروب اتفاق سے کسی ترقی کے دروازے تک پہنچ جاتا ہے جب بھی اسے کوئی فائدہ نہیں۔ سوسائٹی نے تو اس کے ہاتھ جھاڑو سے باندھ دیئے ہیں۔ وہ دروازے کو کھولے گا کیونکر؟

مَیں مانتا ہوں زندگی میں ایسا دَور ضرور آتا ہے جب ہر شخص کو پستی سے گذرنا پڑتا ہے۔ ارتقا کا یہ سب سے پہلا مرحلہ ہے۔ لیکن چند انسانوں کو چھوڑ کر باقی تمام مخلوق کو اس پستی میں زندہ رہنے کے لئے چھوڑ دینا یقیناً دُنیا کا سب سے بڑا ظلم ہے۔ اَور کون کہہ سکتا ہے۔ کہ دنیا کا یہ سب سے بڑا ظلم ہماری سوسائٹی سے وابستہ نہیں ہے؟

دُنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو ترقی کرنے کی قابلیت سے یکسر عاری ہو۔ کسی میں کوئی خوبی ہوتی ہے اور کسی میں کوئی۔ مگر ظالم اپنے اپنی ذاتی اغراض کی خاطر بے شمار انسانوں کی صلاحیتوں کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مظلوم کے جوہر کبھی بھی نہیں اُبھرتے۔

ایک پودے کو ایک جگہ لگا کر اس کے اُوپر بھاری پتھر کھڑا کر دیں تو یہ پودا کسی صورت میں بھی نشوونما حاصل نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح اگر کسی

تیز رَو انسان کے آگے ایک لمبی چوڑی سرنگ کھود دی جائے تو کیا اس کے قدم رُک نہیں جائیں گے ؟

سوسائٹی نے ایسے قوانین بنا دیئے ہیں جو قدم قدم پہ ہمارے آگے سرنگیں بچھا رہے ہیں۔ یہ قوانین کبھی تو نسلی تعصب کے آئینہ دار ہوتے ہیں اَور کبھی ذات پات کے حقوق کے نگہبان، کبھی مذہبی فوقیت لئے ہُوئے اور کبھی ملکی تفوق کے حامل ـــ اَور ان کا وجود صرف اس لئے بروئے کار آیا ہے کہ بعض گروہ اپنی ذلیل حیثیت پر مطمئن رہیں اَور ترقی کرنے کے لئے تمام وسائل خاص افراد کو حاصل ہو جائیں۔

ظالم ہر وقت حاکمانہ جبر و تشدّد ہی سے کام نہیں لیتا، بلکہ وُہ بسا اوقات مظلوم کے ساتھ انتہائی شفقت اَور مہربانی کا سلوک بھی روا رکھتا ہے۔

اَور یہ اس کا خوفناک ترین حربہ ہے!

وُہ اسے تہذیب و تمدن کا سبق پڑھانے کی غرض سے اس کی شجاعت و ہمت کو زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔ وُہ اسے علم کی دولت سے مالامال کرنے کے بہانے اس کے دماغ کو غلامانہ خُو سے روشناس کر دیتا ہے اور وُہ اسکے لئے آرام وہ وسائل ترقی مہیا کرنے کا مقصد ظاہر کر کے اس کی تمام "ذہنی دولت"

کو لوٹ لیتا ہے۔

وُہ علم، وُہ تمدّن، وُہ تہذیب ایک پرِ کاہ کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی، جو آزاد فضا میں نشو و نما پانے والے دل و دماغ کے اندر غلامی کے جراثیم بکھیر دے۔

اَور ظالم اسی طرح اپنا کام نکالتا ہے!

تاریخ کے اَوراق سکندر، فرعون، چنگیز اَور ہلاکو کو ظالم کہتے ہیں، یہ لوگ یقیناً ظالم ہیں اَور تاریخ ان پر لعنت بھیجنے میں حق بجانب، مگر ان مشہورِ عالم ظالموں سے وُہ لوگ انسانیت کے لئے زیادہ خطرناک ہیں، جو ایک نسل اَور اس نسل سے ہونے والی نسل کے دل و دماغ کو "غلام" بنا دیں۔

کل دفتر میں کام کی اتنی زیادتی تھی کہ وقتِ مقررہ کے بعد بھی دو گھنٹے تک سر کھجلانے کی فرصت نہ ملی اَور جس وقت دفتر سے نکل کر گھر کو روانہ ہوا شام کی تاریکی ہر طرف پھیل رہی تھی اَور سردی اتنی شدید تھی کہ جی چاہتا تھا فوراً گھر پہنچ کر بستر میں گھس جاؤں۔

اپنی گلی میں داخل ہوتے ہی میری نظر چند لڑکوں اَور لڑکیوں پر پڑی جو نالی کے قریب کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک طرف کوئی

ابراہیم کی چھوٹی لڑکی زبیدہ زار و قطار رو رہی تھی،

استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ زبیدہ دُودھ لانے کے لئے، گلاس ہاتھ میں پکڑے گلی سے گزر رہی تھی کہ اس کی سہیلی فاطمہ نے اسے بُلا لیا۔ دونوں مائی مُرادو کے مکان کے آگے ٹھہر کر باتیں کرنے لگیں۔ اسی اثنا میں سیٹھ ہیرا لال کا نوکر کوئی بوجھ اٹھائے اُدھر سے گزرا۔ زبیدہ کو اس کا دھکا لگا اور وُہ دھم سے زمین پر گری اور چونّی جو اس کے ہاتھ میں تھی نالی میں بہ گئی، اب بیچاری چونّی کے ضائع ہو جانے پر زار و قطار رو رہی تھی۔

لڑکوں اور لڑکیوں نے نالی میں ہاتھ ڈال کر چونی کو تلاش کیا، مگر بے سود۔ میں نے آگے بڑھ کر زبیدہ کو پیار کیا اور اسے سمجھایا کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے، تیری ماں تجھے نہیں پیٹے گی، مگر اس کے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔

اس پر اپنی کوٹھڑی کے آگے بیٹھے ہوئے بابا دینو نے کہا۔ "بابو جی اسے سمجھا چکا ہوں کہ اب چونّی کھو گئی ہے نہیں مل سکتی۔ مگر یہ تو سنتی ہی نہیں ہے، آپ اسے اس کے گھر لے جائیں اور اس کی ماں سے کہہ دیں۔"

میں نے اپنی جیب سے چونی نکالی اور روتی ہوئی لڑکی کے ہاتھ میں دے دی۔ وُہ دودھ لانے کے لئے گلی سے نکل گئی — میں بھی اپنے گھر پہنچ گیا۔

اس شام مجھے سینما جانا تھا۔ پہلے "شو" کا وقت گزر چکا تھا، اس لئے دوسرا "شو" دیکھنے کا اشتیاق مجھے کشاں کشاں "پیلس تھیئٹر" میں لے گیا۔

پونے ایک بجے سینما سے واپس آ کر میں نے اپنی گلی میں قدم رکھا۔ اس وقت بابا دینو کی کوٹھڑی کے آگے کوئی سایہ حرکت کر رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی اور جب میں نے کہا "کون ہے؟" تو بابا دینو نے کہا۔ "میں ہوں بابو جی! ابھی تک شمو گھر نہیں آیا۔ اس کا انتظار کر رہا ہوں۔"

میں نے قریب پہنچ کر، بابا دینو کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف و دہشت کے اثرات نمایاں تھے۔ میرے دل میں ایک شبہ سا پیدا ہوا کہیں یہ شخص چوری کا ارادہ تو نہیں کر رہا، آخر کوٹھڑی سے باہر نکل کر انتظار کرنے کے کیا معنی؟ دینو کے متعلق مشہور بھی تھا کہ اس نے دو تین مرتبہ مائی مرادو کے پیسے چرا لئے تھے۔

خیر میں گھر پہنچا۔ کپڑے بدلے اور پلنگ پر لیٹنے کا ارادہ کر کے دوسرے کمرے کی طرف چلا۔ یکایک مجھے ایک خیال آیا اور میں بجلی کی روشنی گل کر کے کھڑکی کے پاس آ بیٹھا۔

کچھ دیر تک بابا دینو کوٹھڑی کے پاس کھڑا رہا، پھر اس نے اِدھر اُدھر

دیکھا اور جب اطمینان کر لیا کہ کوئی شخص اس کی حرکت کو نہیں دیکھ رہا تو وہ نالی کے کنارے آ بیٹھا اور اپنا ہاتھ گندے پانی میں ڈال دیا۔

یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے مکان سے نیچے اتر کر دروازہ کھولا۔ اور دبے پاؤں چلتا ہوا دینو کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اس کا بدن سردی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ نالی کے پانی میں کوئی چیز ڈھونڈ رہے تھے۔

دور کچھ شور سا ہوا۔ دینو گھبرا کر اٹھا اور اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔

میں دوبارہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ میرے دل میں نشتر سے چبھ رہے تھے اور میری نگاہوں کے سامنے دینو کی زندگی کے تمام اہم واقعات پھر رہے تھے ——!

جوانی میں یہ شخص پھل بیچتا تھا۔ اور گرمی کے موسم میں پھل کے علاوہ برف بھی۔ جب اس کا اکلوتا بچہ دو سال کا ہوا۔ تو اس کی بیوی دنیا سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئی۔ اب بچے کے لئے دینو باپ بھی تھا اور ماں بھی۔ اس نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر "شمو" کو لکھایا پڑھایا اور اس قابل بنایا کہ وہ ادب کے ساتھ گفتگو کر سکے۔

جب دینو بوڑھا ہو گیا تو اس کے ضعیف ہاتھ پاؤں نے کام کرنے سے انکار کر دیا اور اس پر مستزاد یہ کہ ایک خوفناک بیماری نے اس کی رہی سہی طاقت بھی چھین لی۔

اب اس کی تمام تمناؤں کا مرکز اس کا بیٹا بن گیا۔ باپ نے انتہائی کوشش کی کہ بیٹے کو کہیں ملازمت مل جائے مگر فضول۔ اس نے سیٹھ ہیرالال کی منت سماجت کی، خانصاحب افضل خاں کے گھر کا طواف کیا۔ اور مولوی ابراہیم کے آگے ہاتھ جوڑے۔ لیکن سب نے وعدے ہی کئے اور وعدے کب کسی کا پیٹ بھر سکتے ہیں؟

اُن دِنوں شمّو نہایت نیک لڑکا تھا۔ محلے کا ہر شخص اس کی تعریف کرتا تھا۔ اس زمانے میں اگر اسے ملازمت مل جاتی تو وُہ یقیناً نہایت سعادتمند اور فرمانبردار بیٹا ثابت ہوتا۔

ڈیڑھ سال تک بیکار رہنے کے بعد شمّو کو ایک معمولی سی ملازمت ملی مگر بدقسمتی سے دو مہینے کے بعد ہی افسر نے اسے برطرف کر دیا، کیونکہ افسر کا اپنا بھانجا بیکار تھا۔

شمّو پھر بیکار تھا۔ بیکاری نے اس کے دماغ کو مسموم کرنا شروع کر دیا

اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بوڑھے دینو کا نیک لڑکا بدمعاش بن گیا۔ باپ بھی بیکار اور بیٹا بھی بیکار۔ کھانے پینے کے لئے کہاں سے آئے؛ محلے کے ایک نیکدل آدمی نے روزانہ روٹی کا انتظام کر دیا، ایک اور فیاض شخص ماہانہ ایک حقیر سی رقم بھی دینے لگا۔

اِس طرح دونو باپ بیٹا زندہ ہیں۔

یہ ہیں تمام واقعاتِ حیات اس بدنصیب انسان کے جو اتنی شدید سردی میں نالی کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک حقیر سِکّہ ـــــ چونّی ـــــ تلاش کر رہا تھا۔

آج دوسرا دن ہے معلوم ہوا ہے دینو کو نمونیہ ہو گیا ہے محلے والے اس سے ہمدردی کر رہے ہیں، مگر کون جانتا ہے، اس کی بیماری کی اصل وجہ کیا ہے؟

ـــــــــــــــــــ !

آج کل ہمارے پڑوس میں ایک نہایت عالیشان مکان تعمیر ہو رہا ہے یہ مکان حاجی رحیم بخش کا ہے، جن کے کاروبار کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ شاید ہندوستان میں کوئی بڑا صوبہ ایسا نہیں، جہاں ان کی کپڑے کی ایک آدھ دکان موجود نہیں ہے!

آج سے چار پانچ ماہ پیشتر اس جگہ میاں دولہ کا ایک ٹوٹا پھوٹا دو منزلہ مکان کھڑا تھا، جسے حاجی صاحب نے قرض میں لے لیا تھا۔

میاں دولہ ایک معمولی رنگریز تھا، جس کی دکان گلی کی نکڑ میں پیپل کے درخت کے نیچے واقع تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں بچہ تھا تو میاں دولہ مجھے بہت پیار کیا کرتا تھا۔ میرا اصول تھا کہ جب پیپل کے درخت کے نیچے کھیلنے کیلئے جاتا تو ایک بار میاں دولہ کی دکان پر ضرور جاتا۔ میاں دولہ مجھے دیکھتے ہی مسکرانے لگتا اور پھر مجھے لکڑی کی ایک چمکتی ہوئی چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے اپنی میلی کچیلی پگڑی کے سرے کو کھولنے لگتا۔ اس وقت یا تو مجھے میٹھے چنے ملتے یا پیڑا اور لڈو۔

میاں دولہ کو محلے کے ہر ایک بچے سے محبت تھی، اور ہر ایک بچہ بھی اس سے مانوس ہو گیا تھا۔

بچپن میں تو میں میاں دولہ کے پیار کی نوعیت کو نہ سمجھ سکا۔ جب بڑا ہوا تو معلوم ہوا۔ کہ چونکہ میاں دولہ کے یہاں کوئی اولاد نہیں، اس لئے وہ ہر شخص کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھتا ہے۔

کئی سال گزر گئے ــــــ !

ایک دِن جب میں سکول سے واپس آیا تو امی جان نے بتایا کہ میاں دَولہ ایک لڑکے کا باپ بن گیا ہے۔ اس دِن میں نے میاں دَولہ کی شکل دیکھی وُہ اس قدر خوش تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے انار کے دانوں کی طرح سُرخ تھا اَور وُہ کہولت کی فِطری کمزوری کے باوجود جوان آدمی کی طرح اِدھر اُدھر دَوڑتا پھرتا نظر آرہا تھا۔ دوسرے دِن میاں دولہ نے اپنے تمام عزیزوں اَور رشتہ داروں کو کھانے پر بلایا اور آج تک جتنا روپیہ ایک ایک پیسہ کر کے جمع کیا تھا، اس دعوت کے اہتمام پر خرچ کر ڈالا۔

میاں دَولہ نے اپنے بچے کا نام نُور دین رکھا اَور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ میرا لڑکا میرے گھر کا نُور ہے ــــــ اور حقیقت یہ ہے کہ نور دین تھا بھی اس کے لئے یا یوسیوں کے کثیف اندھیرے میں روشنی کی لہر۔

چند ماہ گزر گئے ــــ

اب میاں دَولہ جب مجھے نظر آتا، بچہ اس کی گود میں ہوتا۔ وُہ دکان پر جاتا تو بچے کو ساتھ لے جاتا اَور رات کو بستر پر لیٹتا تو بچے کو ساتھ سلاتا۔

انہی ایام میں نُور دین کے ختنے کی رسم ادا ہوئی، اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میاں دَولہ نے اس موقع پر انتہائی دریا دِلی کا ثبوت دیا۔ لوگوں

کو ایک بات ہاتھ آجائے تو وہ اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے جب تک اس کے تمام سچے اور جھوٹے پہلو روشنی میں نہ آجائیں۔ میاں دولہ کی دریا دلی بھی اہلِ محلہ کے لئے گفتگو کا ایک عام موضوع بن گیا۔

کسی نے کہا۔ میاں دولہ کو اپنی کوٹھڑی میں سے دولت مل گئی ہے، یہ دولت عہدِ مغلیہ میں کسی امیر آدمی نے چھپا کر رکھی تھی۔ کسی نے کہا۔ میاں دولہ جوا کھیلتا ہے۔ یہ رقم جوئے میں ملی ہے۔ الغرض کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ، مگر اس بات پر سب ہمسائے متفق تھے کہ میاں دولہ کو کوئی "غیبی خزانہ" مل گیا ہے۔ ورنہ رنگریزی سے کیا حاصل ہوتا ہے، چار پانچ آنے روزانہ اگر یہ چار پانچ آنے ہر روز جمع کئے جائیں تو دس سال میں بھی اتنی رقم جمع نہیں ہو سکتی۔ جتنی رقم میاں دولے نے اس تقریب پر خرچ کر دی ہے!

میں یہ سب باتیں سنتا تھا۔ اور میرے دل میں بھی یہ اشتیاق پیدا ہو گیا تھا کہ کسی دن میاں دولے سے حقیقت سنوں۔

چنانچہ ایک دن جب میں سودا سلف لینے جا رہا تھا تو میاں دولہ کو تنہا پایا۔ موقعے کو غنیمت جان کر میں نے باتوں ہی باتوں میں گزشتہ دعوت کا ذکر چھیڑ دیا۔

میاں دَولہ نے بتایا کہ آج کل ڈھائی تین آنے روزانہ دُکان سے ملتے ہیں جس سے بہ مشکل دال روٹی میسر آتی ہے۔ رہی دعوت تو اس کے لئے میں نے اپنا مکان گروی رکھ دیا ہے۔ کیا کرتا، دِل کی آرزو تو پوری کرنی تھی۔"

یہ سن کر وُہ وہم جو میرے دِل میں پیدا ہو چکا تھا، حقیقت کی صورت اختیار کر گیا ــــــ!

"کیوں، تم نے قرض کیوں لیا۔ اپنے کاروبار کا حال معلوم نہیں؟" میں نے پوچھا

"معلوم ہے سب کچھ معلوم ہے، مگر بابوجی ایک اَور بات بھی ہے۔"

"وُہ کیا؟"

"وہ بات یہ ہے بابوجی کہ اگر برادری کو اچھی روٹی نہ کھلاتا تو میری ناک کٹ جاتی۔ لوگ کہتے بچّے کا ختنہ کیا ہے اَور ہمیں پوچھا تک نہیں۔ میرا نوردین زندہ رہے سب قرض ورض اُتر جائیگا۔"

نوردین زندہ رہا اَور چھ برس کی عمر میں سکول بھی جانے لگا۔ میاں دَولہ نے اس خوشی میں ایک اَور شاندار دعوت دی۔ محلے میں ایک بار پھر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ وُہ لوگ جو اس سے پیشتر میاں دَولہ کی غیبی دَولت پہ یقین رکھتے تھے۔ اب حقیقتِ حال سے باخبر ہو گئے۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ میاں دَولہ نے

اپنا مکان فروخت کر دیا ہے۔

لبعضوں نے اسکی کشادہ دلی کی داد دی اور بعض اسکی حماقت پر ہنسنے لگے۔

میاں دولہ کا نورِ نظر اب دوسری جماعت میں پڑھتا تھا اور میاں دولہ اپنے بیٹے کی کامیابی پر اس قدر خوش تھا گویا اسے تمام دُنیا کی دولت مل گئی ہے۔

ایک دن جب میں شام کے وقت گھر لَوٹ رہا تھا۔ تو میاں دولہ کو دیکھا وہ اپنے مکان کے نیچے کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "میاں دَولہ! گھر میں روشنی کیوں نہیں، نور دین تورات کو پڑھتا رہتا ہے!"

"ہاں بابو — جی!"

مَیں آگے بڑھ گیا۔

"با — بو — جی!"

میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، میاں دَولہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

"کیوں دَولہ؟"

"بابوجی! شرم آتی ہے — مکان کے مالک نے سب کچھ چھین لیا ہے کرائے میں۔ بڑی مشکل ہے۔ تیل لینے نکلا تھا مگر دوکاندار نہیں دیتا اُدھار۔"

اب میں نے دیکھا۔ میاں دولہ ہاتھ میں مٹی کا چراغ لئے کھڑا تھا۔ اسکی

آنکھیں زمین پر جمی تھیں، کھڑکی سے نور دین جھانک رہا تھا۔

!

میں سمجھ چکا تھا کہ میرے سینے کا زخم مندمل ہو چکا ہے مگر اب معلوم ہوا کہ دنیا کے تمام زخموں کے مندمل ہونے کا امکان ہے لیکن محبت کا زخم مندمل نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک ناسور ہے جو آخری سانس تک رستا رہتا ہے یہاں تک کہ موت کا ہاتھ اس پر پھاہا رکھ دیتا ہے۔ یہ ایک داغ ہے جو وقت کے ہر لمحے کے ساتھ بڑھتا، پھیلتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ زندگی کی آخری گھڑی آ پہنچتی ہے اور اس گھڑی کے ختم ہونے پر اس داغِ سوزاں کی خلش بھی ختم ہو جاتی ہے!

میں نے جب پہلے پہل اسے اپنے کمرے میں دیکھا تو مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دوسرے عزیزوں کے ساتھ وہ بھی ہمارے یہاں آئی ہوئی تھی۔ مگر جس وقت دوسرے دن اس نے بھابی جان کے ساتھ میرے کمرے میں آ کر مجھ سے موجودہ تقریب کے سلسلے میں بعض بیہودہ رسومات کے متعلق گفتگو کی تو مجھے معلوم ہو گیا کہ میں ایک ایسی لڑکی سے گفتگو کر رہا ہوں جس کا مذاق بہت سلجھا ہوا ہے جو دنیا کی راہوں کے فرسودہ راستے سے ہٹ کر اپنی رائے قائم کرتی ہے اور جو ہر بات پر ہر واقعے پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

اس پہلی ملاقات ہی نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں اس سے مزید گفتگو کرنے کے مواقع ڈھونڈنے لگا۔

تیسرے دن پھر اس سے گفتگو کرنے کا موقعہ مل گیا۔ اسی دن شام کے وقت وہ صابن دانی ہاتھ میں لئے غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے کمرے سے دیکھا اور بغیر یہ سوچے سمجھے کہ اُسے آواز دینی مناسب بھی ہے یا نہیں، یا وہ میری اس بے تکلفی کو بُرا تو نہیں منائے گی، اس کا نام لے کر پکارا اور دل میں یقین بھی کر لیا کہ وہ فوراً میرے پاس آجائیگی۔

چند لمحے گزر گئے، مگر وہ اندر نہ آئی۔ میں نے کمرے سے باہر نکل کر دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ میں تیزی کے ساتھ اس کے قریب پہنچ گیا۔

اس سے پیشتر کہ میں اس سے کچھ کہوں، یا وہ کچھ بولے میرے دل میں ایک بجلی سی لہرا گئی اور اس کے ساتھ ہی دماغ میں ایک بیخودی سی چھا گئی۔

شاہدہ نگاہیں زمین پر جھکائے، دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے رنگین ناخن سے صابن دانی کے ایک کنارے پر جمی ہوئی جھاگ کو کھُرچ رہی تھی۔ دفعتہً اس نے شرمائی ہوئی نگاہیں اُوپر اُٹھائیں اور تولیئے کے ایک سرے سے غیر شعوری طور پر بائیں رخسار کو پونچھتے ہوئے بولی:۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

" مَیں نے کوئی جواب نہ دیا ـــ کوئی جواب دے ہی نہ سکا۔

تبسّم کی ہلکی ہلکی لہریں اس کے سُرخ ہونٹوں پر تیرنے لگیں اس نے مسکرا کر میری حیرت و استعجاب کا مذاق اُڑایا اور اپنی لمبی لمبی پیاری پیاری انگلیوں کو دیوار پر پھیرتی ہوئی چلی گئی۔

مَیں کمرے میں آ کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا ـــ بیٹھنے کو تو بیٹھ گیا مگر اب محسوس ہوتا تھا کہ یا تو میں سو رہا ہوں اور یا میرے دل و دماغ پر ایک نشہ سا چھا گیا ہے۔

دُوسرے دن آپا کی شادی کا ہنگامہ ختم ہو گیا۔ تمام رشتہ دار اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ـــ شاہدہ بھی چلی گئی۔

اس واقعے کو بہ مشکل تین ماہ گذرے ہونگے کہ ابّا جی بیمار ہو گئے۔ شاہدہ اپنی ماں (جو رشتے میں میری خالہ ہیں) کے ساتھ گھر آئی۔ مجھے اس کے آنے کی اطلاع ایک دن پیشتر مل چکی تھی اور میں دل میں عہد کر چکا تھا کہ اب بے تکلفی کے ساتھ اس سے گفتگو کرونگا اور جب وُہ رخصت ہو گی تو اس سے خط و کتابت کا وعدہ بھی لے لوں گا۔

شاہدہ آئی۔ جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا، میری بے چینی بڑھنے لگی اور میں اس سے ملاقات کرنے کے ذرائع سوچنے لگا۔ مگر اب مصیبت یہ تھی کہ شاہدہ جان بوجھ کر میرے ساتھ گفتگو کرنے سے گریز کرتی تھی۔ دو تین بار ایسا ہوا کہ وہ ہنس ہنس کر آپا سے باتیں کر رہی ہے۔ میں جب اس موقعے کو غنیمت سمجھ کر اس کے پاس پہنچا ہوں تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے وہاں سے چلی گئی ہے۔

اس کی یہ روش بہت رنجدہ تھی۔ مگر میں سوچتا تھا، آخر مجھے کیا حق ہے کہ اس سے باتیں کروں، یا وہ میرے ساتھ گفتگو کرنے کی کیوں آرزومند ہو؟

وہ دو دن ہمارے یہاں رہی۔ ان دو دنوں میں میں بمشکل تمام دو چار باتیں اس سے کر سکا۔ جب وہ جانے لگی اور برقعہ لینے کے لئے کمرے میں گئی تو میں دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ جب باہر آئی تو میں نے کہا۔

"بڑی مغرور ہو گئی ہیں آپ! میں بلاتا ہوں آپ بولتی ہی نہیں"۔

وہ صرف مسکرائی اور چلی گئی۔

اس واقعے نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ اور میں نے دل میں ٹھان لی کہ اب اس کے ساتھ مغرورانہ پیش آؤں گا۔

ایکدن میں کسی ادبی رسالے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ایک افسانہ پڑھنے کے

بعد میرے ذہن میں ایک تجویز رینگنے لگی۔ میں نے سوچا کہ اس افسانے کے ہیرو کی طرح میں بھی کیوں نہ اسے ایک خط لکھوں۔

تجویز تو بظاہر معقول تھی مگر اس تجویز کو عملی صورت میں لانے کے لئے متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اگر ابا جان کو میری اس حرکت کی خبر ہو گئی تو وہ لازماً مجھ پر برس پڑیں گے اور اب شاہدہ کسی نہ کسی تقریب پر گھر آ جاتی ہے مگر میری اس حرکت سے مطلع ہو جانے کے بعد اس کا یہاں آنا جانا قطعاً موقوف ہو جائے گا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ اس کی ماں میری بہت عزت کرتی تھی اور جب اسے معلوم ہو گا کہ میں نے اس کی بیٹی کو خط لکھا ہے تو اُس کے دل کو بہت صدمہ پہنچے گا۔ یہ وہ مشکلیں اور ان کے ساتھ اور بے شمار مشکلیں بھی میرے سامنے تھیں، مگر ایک جذبۂ بے اختیار کسی مشکل کو، کسی دِقّت کو خاطر میں نہیں لاتا۔

مَیں نے کسی بہانے آپا سے شاہدہ کے سکول کا پتہ پوچھا اور اس کے نام ایک مختصر سا خط لکھ کر ڈاک کے حوالے کر دیا۔ مَیں نے اس خط میں صرف یہ تحریر کیا تھا کہ "جس دن آپ آپا کی شادی پر یہاں تشریف لائی تھیں اور مجھ سے گفتگو کی تھی، مجھے آپ سے ملاقات کر کے اور آپ کی باتیں سن کر بیحد مسرت

ہوئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں یہ میرے خاندان کی خوش قسمتی ہے کہ آپ ایسی قابل اور لائق لڑکی اس کے آغوش میں پرورش پا رہی ہے۔ جب آپ دوبارہ آئیں تو آپ نے میری کسی بات کا جواب نہ دیا۔ کیا میں اس غیر متوقعانہ رویے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں!"

خط پورا کرنے کے بعد نہ معلوم کیوں ایک غیر مبہم سا خوف میرے دل پر چھا گیا، نہ معلوم کس لئے میری بےچینی، میری بیتابی بڑھتی جاتی تھی۔

ایک ہفتہ، دو ہفتے، ایک مہینہ گزر گیا اور میرے خط کا کوئی جواب نہ آیا ڈیڑھ مہینے کے بعد ایک لفافہ میرے نام آیا۔ لفافہ دیکھتے ہی میرا دل اضطراب مسرت سے لبریز ہو گیا۔

میں نے لفافہ چاک کیا۔ شاہدہ نے جواباً تین سطریں لکھی تھیں اور ان تین سطروں میں اپنی ناقابلیت اور میری قابلیت کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا اور مجھے مخاطب بھی کیا تھا "بھائی جان" لکھ کر ـــــ

میں نے اسی وقت جواب لکھا اور بے تابی میں نہ معلوم کیا کچھ لکھ ڈالا اس خط کا جواب تین ہفتوں کے بعد مل گیا۔

اس کے بعد ہماری خط و کتابت ایک خطرناک دور سے گزرنے لگی۔ ہم معنوی

لحاظ سے پہاڑ کی ایک ایسی چوٹی پہ آپہنچ گئے، جہاں ایک معمولی سی غفلت، ایک ہلکا سا دھکا ہمارا خاتمہ کر سکتا تھا۔

میں نے اسے لکھ دیا کہ اگر میں تمھیں حاصل نہ کر سکا تو خودکشی کر لوں گا۔

اُس نے اِس فقرے کا خوب مذاق اُڑایا اور اسے محض ایک وحشیانہ بیتابی پر محمول کیا۔

بی، اے پاس کرنے کے بعد اباجان اور امّی کو میری شادی کی فکر بیچین کرنے لگی۔ اس زمانے میں اباجان اور امّی دونوں شاہدہ کی لیاقت اور شرافت کی تعریف کرتے رہتے تھے۔ اور امّی تو یہاں تک کہدیتی تھیں کہ اگر میں نے کوئی لڑکی دیکھی ہے تو وہ شاہدہ ہے۔ ماں بیوہ ہے، غریب ہے مگر کیا مجال شاہدہ نے کبھی اپنی غربت کا اظہار کیا ہو۔ ماں نے غیروں کے کپڑے سی سی کر، ہمسائیوں کے برتن مانجھ مانجھ کر بیٹی کو مڈل تک پڑھایا ہے ــــ شاباش ہے ایسی ماں پر، اور آفرین ہے ایسی سعادتمند بیٹی پر۔

تعریفیں سن سن کر میں بہت خوش ہوتا تھا اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔

ایکدن میں نے باتوں باتوں میں آپا جان سے پوچھا۔

"آپ کس کو بھابی بنانے کا ارادہ کر رہی ہیں؟"

آپا نے کہا۔ "امی کو تو کوئی رشتہ پسند ہی نہیں۔ کہتی ہیں میں بیٹے کی شادی وہاں کروں گی، جہاں جہیز بہت ملے۔"

یہ سن کر میں سناٹے میں آگیا ــــ میرے تمام حسین خواب مایوسی کی چٹان سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئے تھے۔

اس واقعے کے بعد جو حادثات پیش آئے انہوں نے میری تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔

ابا جی نے ایک امیر گھرانہ ڈھونڈ لیا۔ گھر والے خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ میں بہتیرا چیخا چلّایا، گستاخ بنا، گھر سے نکل جانے کی دھمکی دی، مگر اس نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا تھا؟

میری منگنی ہو گئی اور شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ جس دن میں گھر سے نکل جانے کی تیاری کر رہا تھا، مجھے شاہدہ کا ایک طویل خط ملا۔ اس نے لکھا تھا:۔

"میں پہلے ہی جانتی تھی کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ ہماری سوسائٹی لڑکی کے گن نہیں دیکھتی، لڑکی کے والدین کا دھن دولت دیکھتی ہے۔ میری ماں غریب ہے ہم دوسروں کی محنت کر کے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میری ماں سوائے میرے تمہارے گھر میں اور کچھ بھی نہیں بھیج سکتی تھی، مگر تمہارے دولتمند والدین کو

لڑکی کے علاوہ دولت کی بھی خواہش ہے۔ اس صورت میں ہماری آرزو کبھی بھی پوری اور کامیاب نہیں ہوسکتی۔ جب تک ہمارے یہاں شادی کے لئے یہ معیار قائم ہے نہ تو غریب لڑکی امیر گھر میں جاسکتی ہے اور نہ غریب لڑکا امیر لڑکی سے بیاہ کر سکتا ہے!

اب رونے دھونے سے کوئی فائدہ نہیں — اب چیخنے چلّانے کی کوئی ضرورت نہیں، جو کچھ ہونا ہے وہ ہوکر رہے گا!

تم جانتے ہو میں نے تمہاری خدمت میں آج تک کوئی درخواست نہیں کی آج پہلی مرتبہ ایک درخواست کرتی ہوں۔ اگر تم نے اسے ٹھکرا دیا تو میرے دل کو سخت صدمہ پہنچے گا اور میں سمجھنے لگوں گی کہ دُنیا نے تو میرے دل کو توڑا کہ اُسے میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی، مگر تم نے میرے ہوکر بھی میرا خیال نہ کیا۔ مجھے بھول جاؤ یا نہ بھولو، مگر اپنی ہونے والی بیوی اور اپنے فرائض حیات کو کبھی نہ بھولنا۔ خدا کی قسم! جب میں دیکھوں گی کہ تم پوری مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض زندگی ادا کر رہے ہو تو مجھے بہت مسرت ہوگی۔"

یہ شاہدہ کا آخری خط تھا!

چند ماہ بعد شاہدہ کی بھی شادی ہوگئی اور وہ اپنے سسرال میں رہتی ہے۔

اگر اُسدن مجھے شاہدہ کا خط نہ ملتا تو نہ معلوم میں کیا کر چکا ہوتا۔ مگر اسکی تحریر نے میرے دِل پر وُہ اثر کیا، جو دُنیا کی کوئی طاقت بھی نہ کر سکتی تھی۔

میری شادی ہو گئی ہے اور میں سینے میں محبت کا زخم چھپائے سب کچھ کر رہا ہوں۔

شاہدہ نے کہا تھا تمہیں ایک اطاعت شعار بیٹا، ایک ہمدرد شوہر، اور ایک شفیق باپ بننا چاہیئے اور میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ یہ تینوں خوبیاں میرے اندر پیدا ہو جائیں۔ مگر کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ سوسائٹی نے مجھ پر اور شاہدہ پر ظلم کیا ہے۔ کیوں نہ ایسی ظالم سوسائٹی کے خلاف بغاوت کی جائے؛

ماں نے ایک بار نہیں دس بار منع کیا۔ باپ نے بھی بہتیرا روکا، مگر شبیر و کے سر پر نئے سبق کا بھوت کچھ اس طرح سوار تھا کہ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ قمیص اتاری، اس میں "اُردو کی پہلی کتاب" کو احتیاط کے ساتھ لپیٹا اور پھر اس بستہ کو بغل میں دبا کر گھر سے نکل آیا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ بارش تھم چکی ہے، اس لئے چودھری "دین" کے گھر تک پہنچنے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا۔

مگر اب جو اس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا تمام راستے پر ایک ندّی سی بہ رہی ہے۔ کوئی اَور کام ہوتا تو وہ اس پانی اَور کیچڑ میں آدھ میل چلنے کے لئے بھی تیار نہ ہوتا، مگر یہ معاملہ پڑھائی کا تھا۔ اس لئے اس نے ایک لمحہ توقف کئے بغیر اپنے پاؤں پانی میں ڈال دیئے اَور تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔

اس کی عادت تھی کہ جب مُول چند پنساری کی دکان پر پہنچتا تو ایک پیسے کے میٹھے چنے ضرور خرید لیتا اور ایک ایک دانہ کر کے منہ میں ڈالتے ہوئے یہ پورے تین میل کا سفر طے کرتا۔

چنانچہ آج بھی اس نے پنساری کی دکان پر پہنچ کر اپنے تہمد کی گرہ کھولی اَور ایک پیسہ نکال کر اسکی میلی کچیلی گدّی پر رکھ دیا۔ پنساری دکان سے باہر کسی سے باتیں کر رہا تھا جب اُس نے شیرو کو دیکھا تو وہیں سے آواز دی :-

"بابو جی، آیا ذرا ٹھہریئے"!

مول چند شیرو کو بابو جی کہتا تھا۔ اسکی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ شیرو کو حقیقتاً بابو جی سمجھتا تھا، بلکہ وہ اس خطاب سے اس کی پڑھائی کے شوق کا مذاق اڑاتا تھا۔ شیرو نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا کہ مجھے میرے نام ہی سے پکارا کرو، مگر پنساری اس کی اس طرح ہمت افزائی کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ شیرو نے

اس خطاب کو بُرا نہ منایا۔ آخر وُہ "اردو کا قاعدہ" پڑھ چکا تھا اور یہ کتاب بھی "ماہ حلیمہ" میں ختم ہو رہی تھی۔ اس لیئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ بابو کے لفظ کو بُرا سمجھے۔ ہر شخص جو علم حاصل کرتا ہے، بابو کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

"بڑی ہمّت ہے بابا تم میں! سچ مچ ایک دن سردار ہرنام سنگھ بن جاؤ گے۔" مولچند نے گدی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

شبیرو کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اس نے بے اختیارانہ استفسار کیا۔ "وُہ تو منصف بننے والا ہے!"

"ہاں تو کیا ہوا۔ تم کو بھی ایسا عہدہ ملے گا۔ علم بڑی دولت ہے!"

شبیرو کی رگ رگ میں ایک سرور سا دوڑنے لگا، اس کے ذہن کی سطح پر پرسوں والے سبق کے حروف اُبھر آئے۔

"علم بڑی دولت ہے! جو شخص علم حاصل کریگا، بڑا آدمی بنے گا۔" شبیرو کے دل پر ایک خوشگوار خیال چھا گیا۔ یکایک پنساری کے ترازو کا پلہ اس کی طرف جھکا، اس نے چنے پگڑی میں باندھ لئے اور پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ قدم اُٹھانے لگا۔ اسکی نگاہوں کے سامنے ہرنام سنگھ کا بارعب چہرہ پھرنے لگا۔ ہرنام سنگھ سردار نہال سنگھ کا بیٹا تھا، جو شہر سے علم حاصل کر کے،

گاؤں واپس آ گیا تھا۔ تمام گاؤں والے اس کی بے حد عزت کرتے تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہرنام سنگھ بہت جلد منصف بن جائیگا۔ چند منٹ کے بعد یہ چہرہ غائب ہو گیا اور اس کی بجائے ایک خوبصورت کمرہ نمودار ہو گیا۔ وہ خیال کرنے لگا، ایک دن وہ بھی ہرنام سنگھ جتنی عزت حاصل کریگا، تمام لوگ اسے بھی میاں جی کہہ کر پکارینگے اور وہ بگھی میں بیٹھ کر شہر جایا کرے گا۔ ان خوش گوار توقعات کے ہجوم میں اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ بارش نے اس کی پگڑی کو بھگو دیا ہے۔ اس نے بستے کو دائیں بغل سے نکال کر بائیں بغل میں لے لیا اور دوڑنے لگا۔

قریباً ڈیڑھ میل طے ہو چکا تھا اور ڈیڑھ میل باقی تھا۔ وہ ایک دکان کے چھپر کے نیچے ٹھہر گیا کہ بارش تھمے، تو پھر چلنا شروع کر دے۔ یکایک اس نے دیکھا کہ سردار ہرنام سنگھ بھاگتا ہوا ایک طرف جا رہا ہے اور اس کے پیچھے لوگوں کا ہجوم دوڑ رہا ہے۔ وہ بھی ان کے ساتھ چل دیا۔

ہجوم منشی مہتاب رائے کے مکان میں داخل ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر شیرو کو معلوم ہوا کہ آج یہاں کوئی افسر کسی ضروری کام کے لئے آیا ہے اور اس وقت اسی عمارت میں ہے۔

یکایک شبیرو نے دیکھا کہ ایک انگریز کرسی پر بیٹھا ہے اور اس کے سامنے ہرنام سنگھ بڑے ادب کے ساتھ کھڑا ہے۔

چند لمحوں کے بعد افسر بولا۔ "تمھارا گاؤں بہت گندا ہے۔ تم لوگ گدھے ہو ـــ بہت گدھے ـــ جانور!"

اس کے جواب میں ہرنام سنگھ نے جواب دیا:۔

"جی جناب! حضور بالکل بجا فرماتے ہیں!"

"تم لوگوں کو شیم ہو"۔ افسر نے منہ بنا کر کہا۔

"جی حضور! جناب درست فرماتے ہیں" ہرنام سنگھ نے پہلے کی طرح مؤدبانہ جواب دیا۔

"پاگل آدمی!"

"جی حضور!!"

شبیرو کی بغل میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ وہ باہر نکل آیا، کتاب کو قمیص میں سے نکالا اور اسے کیچڑ میں پھینک کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اگر کوئی شخص امام دین قصاب کی دکان کے قریب کھڑے ہو کر شاہجہان

پریس کے دروازے کے عین اوپر نگاہ ڈالے تو اس کو "ہوالحافظ" کے نیچے یہ عبارت لکھی ہوئی نظر آئے گی:-

"تکمیل یافت در ۶، ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ ہجری"

یعنی شاہجہان پریس کو قائم ہوئے بیس سال سے زاید عرصہ گذر چکا ہے۔ بیس سال کی مدت کوئی معمولی مدت نہیں، اس طویل عرصے میں ایک بااصول کاروباری آدمی کامیابی کی بلند سے بلند سطح پر پہنچ سکتا ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ شاہجہان پریس کے پروپرائیٹر حاجی ابراہیم کو دنیا ایک با اصول کاروباری آدمی ہی سمجھتی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ حاجی صاحب صرف عام کاروباری ذہنیت کے مالک ہیں۔ ہرگز نہیں، سب لوگ انہیں نیک طینت کشادہ دل اور غریب پرست آدمی کہتے ہیں اور پریس کے ملازموں میں چپڑاسی سے لے کر مینیجر تک ہر شخص ان کے گُن گاتا رہتا ہے۔ حاجی صاحب کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی شخص کو بھی ان کے خلاف شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔ گاہکوں کو وقت پر کام دیا جاتا ہے اور ملازموں کو باقاعدہ تنخواہ، جب یہ حال ہو تو پریس جس قدر شہرت حاصل کرے کم ہے۔

حاجی صاحب اپنے ملازموں پر مہربان ہیں اور ملازم حاجی صاحب کے

حُسن سلوک سے متاثر۔ صرف گزشتہ سال کچھ گڑبڑ سی ہو گئی تھی، مگر حاجی صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے معاملہ رفع دفع کر دیا تھا۔ بات یہ تھی کہ پریس کے پرانے مشین مین خدابخش نے چند ملازموں کو ہم آہنگ بنا کر تنخواہ میں ترقی کا سوال پیدا کر دیا۔ حاجی صاحب نے خدابخش کو اپنے کمرے میں بلایا اور اسے نہایت نرمی سے کہا:۔

"خدابخش! بتاؤ میں نے آج تک تمھاری کوئی تنخواہ یا تنخواہ میں سے ایک کوڑی بھی ہضم کی ہے؟ تمہیں دوسرے پریسوں میں ملازموں کی حالت کا علم نہیں ابھی ابھی نواب پرنٹنگ پریس کا منیجر میرے پاس آیا تھا۔ کہتا تھا کہ اب پریس چند دن کا مہمان ہے، ساڑھے چار مہینے ہو گئے ہیں مگر ابھی تک کسی ملازم کو بھی تنخواہ نہیں ملی۔ مگر میں اس بات کو نہایت بیہودہ حرکت سمجھتا ہوں۔ تمہیں خبر نہیں کہ بعض اوقات تم لوگوں کو تنخواہ دینے کے لئے مجھے کس دشواری سے رقم قرض اٹھانی پڑی ہے۔ تم کیا جانو مجھے تمہاری ہر تکلیف کا کتنا خیال رہتا ہے۔ میرا اصول ہے کہ مزدور کو ہر حال میں خوش رکھنا چاہیے، کیونکہ خوشدل مزدور زیادہ محنت اور توجہ سے کام کرتا ہے۔ رہا ترقی کا سوال، تو اس کے متعلق تمہیں یقین رکھنا چاہیئے کہ جیسے ہی گنجائش نکلتی ہے، تمہاری تنخواہ میں ترقی کر دی جاتی ہے۔

میں جانتا ہوں تم لوگوں کی موجودہ تنخواہ کم ہے لیکن میں کیا کروں ؟ اچھا میاں خدا بخش ! اب تم جاکر کام کرو ، دو تین ماہ تک سیٹھ ہیرالال کے فرم کا کام ملنے والا ہے ، اس کے بعد ترقی ہی ترقی ہے "

خدا بخش نے گردن جھکا کر سب کچھ سنا اور باہر آکر اپنے ساتھیوں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ تین ماہ تک ہم سب کی تنخواہوں میں ترقی ہو جائیگی۔ ہر ایک ملازم کو بیحد مسرت ہوئی۔ اس خوشی میں نواب نے جو اپنی کنجوسی میں خاصی شہرت رکھتا تھا ، بیڑیوں کا ایک بنڈل رحیم کو بالکل مفت دے دیا اور لبھو رام نے ایک بھاری پتھر کو صاف کرتے کرتے اسے اس طرح پرے ہٹایا کہ دینو کو اس کی "پہلوانی" کا یقین ہو گیا۔ موجی نے معراج دین کی سرخ ٹوپی کا پھندنا توڑ ڈالا — مگر معراج دین ہنستا رہا اور خدا بخش نے اس دن ساڑھے سات بجے تک کام کیا ، حالانکہ اسے پانچ بجے چھٹی مل گئی تھی۔

دن پہ دن گزرتے گئے ، سیٹھ ہیرالال کے فرم کا کام بھی مل گیا اور ختم بھی ہو گیا ، مزدور بڑی بیتابی کے ساتھ تیرہ تاریخ کا انتظار کرنے لگے۔

آخر خدا خدا کرکے وہ دن آیا۔ مینیجر ایک سرخ رنگ کا لمبا سا رجسٹر لیکر اپنے کمرے سے باہر نکل کر کرسی پر آ بیٹھا۔ سب مزدوروں کے دل دھڑکنے

لگے۔ سب سے پہلے فیروز صحیح مینجر کے پاس آیا۔ جیسے ہی اس نے نوٹ ہاتھ میں لئے، بسورتے ہوئے بچے کی طرح اس کا سیاہ ہونٹ لٹک گیا۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ کوئی ترقی ورقی نہیں ہوئی۔

خدا بخش نے مینجر سے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کہتے ہیں مجھے ایک ہزار روپیہ قرض دینا ہے جب یہ قرض بیباق ہو جائیگا تو ہر ایک کی تنخواہ میں پانچ پانچ روپے ترقی کر دی جائیگی۔ مزدوروں نے سنا اور اُن کے دل مطمئن ہو گئے، بات معقول تھی۔ حاجی صاحب نے جو کچھ کہا تھا درست کہا تھا۔ اگر قرض بیباق نہ کیا جائے تو ہر ماہ دس روپے مفت دینے پڑتے ہیں بہتر یہ ہے کہ قرض بیباق کر دیا جائے۔

کام باقاعدگی کے ساتھ جاری رہا۔ چار مہینے گزر گئے۔ اب تو حاجی صاحب کے رویئے کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جب بارہ بجے روٹی کھانے کیلئے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوتی تو تمام ملازم باہر امام دین قصاب کی دکان کے چبوترے پر جا بیٹھتے اور حقے کے لمبے لمبے کش لگا کر تنخواہ میں ترقی کے اہم مسئلے کے متعلق رائے زنی کرتے۔ خدا بخش کہتا "میرا خیال ہے یہ ساری شرارت "منی جر" کی ہے۔ وہی حاجی صاحب کو سکھاتا پڑھاتا رہتا ہے۔ ایک کام کرو۔ ہر ایک "منی جر" کے خلاف

حاجی جی سے شکایت کرے، تنگ آکر حاجی جی اسے نکال دیں گے۔ کیوں فیروز، تم نے دیکھا تھا کل کس طرح حاجی جی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔"

فیروز جواب دیتا۔ "سچی بات تو یہ ہے وہ بیچارا کر ہی کیا سکتا ہے۔ تنخواہ دینے والا حاجی ہے، مینجر اپنی جیب سے تھوڑی تنخواہ دیتا ہے، جو اس کے خلاف شکائتیں کرتے پھریں۔ بدھو ہونا آخر!"

خدا بخش کہتا۔ "میں کہتا ہوں سب شرارت اسی کی ہے، میں جب حاجی جی کے پاس گیا تھا تو انہوں نے مجھے بڑی عزت سے بلایا تھا۔ آج تک انہوں نے مجھے کبھی گالی نہیں دی، کبھی برا بھلا نہیں کہا اور اس دن تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب سیٹھ ہیرالال کے فرم کا کام ختم ہو جائے گا تنخواہ میں ترقی ہو جائے گی۔ تم جانتے ہو، حاجی جی جھوٹ نہیں کہتے —— میں کہتا ہوں یہ "منی جر" ہمارا بیڑا غرق کر رہا ہے۔"

اس پر سردار علی اپنی سیاہ بھدّی انگلیوں سے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتا۔

"اگر مینجر کو نکال دیا گیا تو کون مینجر ہو گا۔ میرا خیال ہے مولوی جی اصغر کو —— کیوں ٹھیک ہے نا؟"

مگر یہ بات زیادہ توجہ کے قابل نہ تھی۔

دوسرے مہینے تیرہ تاریخ کو تنخواہ تقسیم ہونے لگی۔ مینجر ایک سرخ رنگ کا لمبا سا رجسٹر لے کر کرسی پر آ بیٹھا۔ خدا بخش نے سب سے آخر میں تنخواہ لی۔ اور نوٹ میز پر رکھ کر کہنے لگا "منی جر صاحب! حاجی جی نے ہم سے کہا تھا کہ تم سب کی تنخواہوں میں ترقی ہو جائیگی، مگر ہم کو تو ایک کوڑی بھی زیادہ نہیں ملی۔"

"میں کیا جانوں یہ بات ــــ حاجی صاحب جو کچھ مجھے دیتے ہیں تقسیم کر دیتا ہوں، وہ زیادہ دیں گے تو زیادہ دوں گا۔ میں بھی تو تمہاری طرح ملازم ہوں ــ پریس کا مالک نہیں ہوں۔ سُنا، لو انگوٹھا لگاؤ ــــ مجھے ابھی کئی کام کرنے ہیں!"

اسی دن خدا بخش نے قسمیں کھا کھا کر سب ملازموں کو بتا دیا کہ "منی جر ہمارے ساتھ دشمنی کر رہا ہے۔ ہم اس کو برخاست کروا کر ہی دم لینگے۔"

کئی دن تک مینجر کے خلاف معقول ذرائع اختیار کرنے کے متعلق غور ہوتا رہا۔ کئی ملازم مینجر کو بے قصور سمجھتے تھے، اس لئے کوئی تجویز بروئے کار نہ آسکی۔ انہی دنوں میں ایک واقعے نے سب کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا

رکہ مینیجر ہمارے ساتھ دشمنی کر رہا ہے اور تنخواہ میں ترقی نہ ہونے کی وجہ صرف مینیجر کی مخالفت ہے۔ معاملہ یوں رونما ہوا کہ جمعرات کے دن حاجی صاحب بہت خوش خوش پریس میں آئے اور آتے ہی منو چپڑاسی سے چلم بھرنے کو کہا۔ خدا بخش نے اس موقعے کو غنیمت جانا، جھٹ چلم بھر کر مولوی صاحب کے سامنے لے گیا۔

مولوی صاحب نے ہنسکر کہا:۔

"خدا بخش! اتم آج کل بہت موٹے ہوتے جاتے ہو۔ تمہاری بیوی تمہیں کیا کھلاتی ہے؟"

خدا بخش نے ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا۔ "حاجی جی! آپ تمخول کرتے ہیں۔ اُلٹا ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"کیا مصیبت ہے؟"

"حاجی جی" — خدا بخش نے آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔ "گھر کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ بوڑھے ماں باپ ہیں، بھائی بیکار ہے، بیوی بھی آگئی ہے۔ حاجی جی! آپ نے ــــ وہ بات ــــ حاجی جی!"

"کیا بات، کہو بھی"

"وہی بات! ــــ ترقی والی ــــ تنخواہوں میں!"

"اچھا"— حاجی صاحب نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر مینیجر سے مخاطب ہوئے۔"کیوں مینیجر صاحب! کچھ ہے گنجایش —؟ لالہ عطر چند نے بل ادا کر دیا ہے؟"

"نہیں قبلہ!"

"اور سائیں جلال دین نے؟"

"نہیں حاجی صاحب!"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی کوئی گنجایش نہیں؟"

"جی ہاں فی الحال کوئی گنجائش نہیں!"

حاجی صاحب نے آرام کرسی کے بازو پر انگلیاں پھیرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔"دیکھ لو خدا بخش! مینیجر صاحب فرما رہے ہیں ابھی کوئی گنجائش نہیں وہ مجھے کچھ کہیں بھی— اچھا دو چار ماہ اور صبر کرو!"

خدا بخش باہر آگیا اور باری باری ہر ایک مزدور کے پاس جا کر قسمیں کھا کر کہا کہ مینیجر ہی حاجی صاحب کو ترقی دینے سے روکتا ہے۔ سب ملازموں کو یقین ہو گیا کہ واقعی مینیجر ہی ہمارا دشمن ہے۔

دوسرے دن مینیجر کی مخالفت کا پروگرام شروع ہونے والا تھا، مگر

اس دن حاجی صاحب نے ایک عالیشان مکان خریدنے کی خوشی میں پریس کے ملازموں کو نصف دن کی چھٹی دیدی۔

ایک ہفتے کے بعد پریس کے ملازموں نے مینجر کے خلاف شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔ فیروز نے جو جھوٹ بولنے میں کافی مہارت رکھتا تھا، حاجی صاحب سے کہدیا کہ ہمارا مینجر نواب پریس کے مینجر سے سانہ بانہ رکھتا ہے اور وہاں سے اسے کمیشن ملتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مینجر کو برخاست کر دیا گیا۔ اس دن پریس کے تمام ملازم مسرور تھے اور اُن کے اظہار سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔

صبح حاجی صاحب نے تمام ملازموں کو یہ کہا۔ "آئندہ جو شخص تمہیں تکلیف دے، مجھے اطلاع دینا۔ میں کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص میرے ملازموں کو تنگ کرے۔

مہینے کی تیرہ تاریخ تھی، تمام ملازم تنخواہ کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر مینجر کا دروازہ کھلا، مگر مینجر کے بجائے حاجی صاحب نکلے۔ وہ بہت مسرور تھے اور کوئی گیت گنگنا رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد نیا مینجر باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک

سُرخ سا لمبا رجسٹر تھا۔ ملازم اپنی قمیصوں سے ہاتھ صاف کرنے لگے۔ مینجر کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "چونکہ پریس کا کام بہت بڑھ گیا ہے، اس لئے ہر شخص کی تنخواہ میں پانچ پانچ روپے کی تخفیف کی جاتی ہے۔"

!

ایک دولتمند انسان کو تفریح طبع کے ہزار در ہزار ذرائع حاصل ہیں وہ سینما جا سکتا ہے، ملک ملک کی سیر کر سکتا ہے، قسم قسم کے کھیلوں میں حصہ لے سکتا ہے، ریڈیو سے نئے نئے گانے سن سکتا ہے، الغرض اس کو وقت گزرتا ہوا معلوم ہی نہیں ہوتا۔ اسکی ساری زندگی میں کوئی وقت بھی ایسا نہیں آتا جب "تفریحی مصروفیات" کا ہجوم اس کا منتظر نہ ہو۔ مگر اس کے مقابلے میں غریب کو دل بہلانے کا صرف ایک ہی ذریعہ میسر ہے اور وہ ہے وقتی طور پر جنسی خواہش کو پورا کرنا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں اسکی بیوی طرح طرح کی خوفناک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے وہاں اس کی اولاد میں سے کوئی بچہ صحت مند اور خوبصورت نظر نہیں آتا۔ کسی کا پیٹ بڑھا ہوا ہے تو کسی کے بازو بہت کمزور ہیں۔ کوئی ہر وقت بخار میں مبتلا رہتا ہے تو کوئی ایسی خطرناک بیماری میں جکڑا ہوا ہے کہ اسکی ذہنی نشو و نما رک گئی ہے۔

امیر کے یہاں بہت کم بچے ہوتے ہیں مگر اس کا ہر بچہ نہایت تندرست اور خوبصورت ہوتا ہے۔ غریبوں کے یہاں درجنوں بچے پیدا ہوتے ہیں مگر تمام کے تمام مریل، بیجان کمزور اور نحیف و نزار!

امیر کے بچے ایسے ماحول میں پرورش پاتے ہیں کہ ان کی جسمانی نشو و نما بھی ہوتی رہتی ہے اور ذہنی نشو و نما بھی۔ اور غریبوں کے بچے —— ؟ بیچارے تربیت کے لحاظ سے پیدا ہوتے ہی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیئے جاتے ہیں اور دم واپسیں تک یہاں مقید رہتے ہیں۔ ان کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ زندگی کی بلندی اور روشنی بھی کوئی چیز ہے، انہیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ انسانی زندگی بھی کوئی قدر و قیمت رکھتی ہے!

ہمارا ملک غریبوں اور فاقہ کشوں کا ملک ہے، بیرونی لوٹ کھسوٹ نے اسے غربت کی انتہائی گہرائی میں دھکیل دیا ہے۔ اس لئے یہاں والدین کی بیشتر تعداد پیٹ بھرنے کیلئے روزی کمانے میں مصروف رہتی ہے، انہیں اولاد کی طرف توجہ دینے کا موقعہ ہی نہیں ملتا اور اس کا ہولناک نتیجہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے!

موجودہ نسل نہ تو جسمانی لحاظ سے کسی ترقی یافتہ قوم کا مقابلہ کر سکتی ہے

اور نہ ذہنی لحاظ سے۔ ذرا غور کیجئے، اگر بچوں کی تربیت کا یہی حال رہا تو کبھی امید ہو سکتی ہے کہ ہمارا ابد نصیب غلام ملک بھی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہو سکتا ہے؟ ذیل کا واقعہ نہایت معمولی واقعہ بھی ہے اور انتہائی عبرتناک بھی۔ نہایت معمولی اس وجہ سے کہ ایسے واقعات غریب گھرانوں میں اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں اور انتہائی عبرتناک اس نقطۂ نظر سے کہ یہ حادثات قوم و ملک پر بہت برا اثر ڈال رہے ہیں۔

آج سے سات سال پیشتر مجھے ہاکی کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ جب ہاکی کھیلنے کے بعد شام کے وقت میں گھر کو روانہ ہوتا تو لاہور کی متعدد غلیظ گلیوں میں سے گزرنا پڑتا۔ انہی گلیوں میں سے ایک گلی میں خدا بخش کا ٹوٹا پھوٹا مکان بھی تھا۔ خدا بخش منا کو اور چلیبیں بیچا کرتا تھا، بھاٹی دروازے میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف اس کی دکان تھی۔

چونکہ میں ہر روز اس گلی میں سے گزرتا تھا، اس لئے خدا بخش سے میری معمولی سی واقفیت پیدا ہو گئی تھی۔ جب کبھی وہ مجھے اپنے مکان کے آگے گزرتے ہوئے دیکھتا تو ضرور کہتا "آ گئے بابو جی کھیل کر" ــــ اور میں جواب دیتا "ہاں بابا جی" اور چلا جاتا۔

ایک دِن جب میں اس کے مکان کے آگے گزر رہا تھا تو میں نے چیخوں کی آواز سنی۔ یہ آواز خدا بخش کے مکان ہی سے آ رہی تھی۔ سردی کا موسم تھا، اس لئے خدا بخش کے مکان کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، ایک دو منٹ کے بعد ایک دُبلے پتلے لڑکے نے دروازہ کھول دیا اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"بابا خدا بخش گھر پہ ہیں یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔ اسکے جواب میں لڑکا اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اس دوران میں خدا بخش نے میری آواز سن لی تھی' اس لئے وہ خود دروازے تک آ گیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "بابا! یہ تمہارے مکان سے چیخوں کی آواز آ رہی ہے، کیا بات ہے؟"

کہنے لگا "ان بچوں کی ماں کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ آپ دروازے پر کیوں کھڑے ہیں چلئے اندر! کبھی غریبوں کے گھر میں بھی بیٹھ جایا کریں۔"

مجھے اس روز ایک نہایت اہم کام انجام دینا تھا، مگر خدا بخش کا لہجہ اس قدر موثر تھا کہ میں اس کی درخواست رد نہ کر سکا' اندر جا کر ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اب دیکھتا ہوں اردگرد تین چارپائیاں ہیں اور تینوں پر بچے گندے اور پھٹے ہوئے لحاف اوڑھے سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔ میرے بیٹھتے ہی ایک عجیب تماشا ہونے لگا۔

سب سے پہلے میرے سامنے کی چارپائی پر ایک بچے نے لحاف ہٹا کر مجھے دیکھا اور پھر ہنس کر منہ چھپا لیا۔ پھر دوسرے بچے نے یہ حرکت کی اور اس کے بعد تیسرے بچے نے۔ گویا ایک چارپائی پر تین بچے لیٹے ہوئے تھے۔ یکایک اس چارپائی کی پائنتی سے بھی لحاف ہٹا اور کسی بچے کے سیاہ بال نظر آنے لگے ــــ دوسری چارپائیوں پر بھی دو دو تین تین بچے ہوں گے۔ خدا کی پناہ!

یہ بیچارا خدا بخش حقے کی چلموں اور تمبا کو سے کیا کماتا ہو گا کیونکر اپنا، بیوی کا اور ان بچوں کا پیٹ بھرتا ہو گا؟ اور ان بچوں کی تربیت ـــــ ؟؟؟ ایسا غریب باپ اپنے بچوں کے لئے تعلیم کا بندوبست کر سکتا ہے ان کے لئے اچھی غذا مہیا کر سکتا ہے؟

میں انہی خیالات میں غرق خدا بخش کی باتوں کا بے توجہی سے جواب دے رہا تھا کہ کوٹھڑی سے چیخوں کی آواز آئی۔

میں نے کہا۔ "بابا! کسی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے؟"

"ہاں صبح حکیم عبد الستار کو ہاتھ دکھایا تھا۔ اس نے سات پڑیاں دی ہیں سات دِن کی خوراک ہے۔"

اب حکیم عبد الستار کے متعلق سنیئے۔ یہ حضرت بازار کے موڑ پر ایک معمولی شربت فروش ہیں۔ میں نے کہا "کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا۔"

یہ فقرہ کہنے کو تو میں نے کہدیا مگر دل میں شرمندہ ہونے لگا۔ ایک غریب شخص کی جیبیں اسے ڈاکٹر کے درِ دولت پر حاضر ہونے کی اجازت دیسکتی ہیں؟

چند منٹ کے بعد چیخیں رُک گیئں

یکایک میری نگاہ کوٹھڑی کے اندر ایک گیارہ بارہ سال کی لڑکی پر پڑی۔ اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا اور اسکی آنکھوں سے انتہائی وحشت برس رہی تھی۔

"کیوں حسنو!" باپ نے اس سے پوچھا۔ لڑکی چپ چاپ کھڑی رہی۔ باپ نے دو تین فحش گالیاں سُنا کر پھر اپنا سوال دُہرایا۔ لڑکی چپ چاپ اندر چلی گئی دو تین لمحوں کے بعد وہ پھر آئی اور اب اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا "لہو.... ہاں

میں اور خدا بخش دونوں بھاگ کر اندر گئے آہ اس وقت جو منظر میری نگاہوں نے دیکھا وہ اب بھی میرے دل پر ایک لرزہ ساطاری کر دیتا ہے۔

خدا بخش کی بیوی اور اُس کے ایک درجن بچوں کی ماں خون میں لت پت

پڑی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ اُرد کی طرح سفید تھا اور آنکھیں پھٹی پھٹی۔
میں ڈر گیا اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو بلا لایا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔
اور کہنے لگی " مر گئی بیچاری اسقاطِ حمل سے "۔

دنیا کی ہر حکومت، ہر مذہب اور ہر قانون اس بات پر زور دیتا ہے کہ
اس کرۂ ارض پر جو شخص بھی سانس لے رہا ہے اُسے زندہ رہنے اور زندہ رہنے
کے ساتھ ساتھ ہر وقت ترقی کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔

مذہب اپنے شیریں لہجے میں کہتا ہے " اے انسان! آ میرے آغوشِ محبت
میں آ۔ میں تیرے لئے دین اور دنیا، دونوں کی فلاح اور کامیابی کا پیغام لیکر
آیا ہوں "۔

قانون ہمارے سروں پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے کہتا ہے۔ " اے
ابنائے آدم! تمہیں ذرہ بھر گھبرانے کی ضرورت نہیں میں تمہاری ذات کی
حفاظت کرتا ہوں اور تمہاری ہر طرح کی ترقی کا ذمہ دار ہوں "۔

حکومت بڑی محبت سے ہمیں مخاطب کر کے کہتی ہے " اے میری پیاری
رعایا! مجھے تم سے مادرانہ محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہارے آرام

اور چین کے لئے یہ خوبصورت کشادہ سڑکیں، یہ بڑے بڑے دار العلوم، اور یہ جابجا شاندار دفتر کھول دیئے ہیں۔"

دوسرے لفظوں میں انسان بیحد خوش قسمت ہے کہ دنیا میں ہر وہ چیز، ہر وہ طاقت جو اسکی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے اسکے لئے ہر لحاظ سے مفید ہے اور اس کی جسمانی اور روحانی ترقی کا ذمہ لیتی ہے وہ انسان بڑا ہی خود غرض اور احسان فراموش ہے، جو ایسے پیار کرنے والے مذہب، ایسے شفیق قانون، اور ایسی ہمدرد حکومت کی پروا نہ کرے اور ان تینوں کے احسانات جلیلہ کا تہ دل سے شکر گزار نہ ہو۔

مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا دنیا کا ہر قانون، ہر حکومت، ہر مذہب جو کچھ کہتا ہے، اس پر عمل بھی کرتا ہے؟ اگر یہ تینوں صحیح معنوں میں، انسانیت کے درد سے لبریز ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج دنیا کے چپے چپے پر انسانیت کو کچلا جا رہا ہے کرۂ ارض کے ہر گوشے میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے اور اس وسیع و عریض زمین پر انسان کو کہیں بھی چین میسر نہیں!

مذہب کا تو دعویٰ ہے کہ وہ ہمارے لئے دینی اور دنیاوی فلاح و ترقی کا پیغام لیکر آیا ہے، مگر اس پیغامبر فلاح و ترقی کے نام پر یہ وحشیانہ قتل و

غارت کیا معنی رکھتی ہے؟

قانون پکار پکار کر کہتا ہے میں ہر شخص کی جان و مال کا ذمہ دار ہوں، میرے ایک ہاتھ میں انصاف کا ترازو ہے اور دوسرے ہاتھ میں سزا کی تلوار، لیکن انصاف پرست قانون ہی کے سائے میں دنیا کی بڑی بڑی بے انصافیوں کا کیا مطلب ہے؟

حکومت چیخ چیخ کر بتاتی ہے کہ جب تک میرا وجود ہے ہر ذی روح زندہ رہے گا، میں ہر زندگی کی حفاظت کرتی ہوں، مگر اس انسانیت نواز حکومت کا اپنے تاج و تخت کے جھوٹے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے بے شمار انسانوں کو تیغ کے گھاٹ اتار دینا کیا مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے؟

اگر مذہب واقعی دین و دنیا کی فلاح و ترقی کا پیغامبر ہے تو اس کے ماننے والوں کو ذرہ ذرہ اختلاف پر ایک دوسرے کی جان کا دشمن تو نہ ہو جانا چاہیئے اس میں کون سی دینی اور دنیاوی ترقی کا راز پوشیدہ ہے اس میں کون سی روحانی رفعت پائی جاتی ہے؟

کیڑے مکوڑے بھی جنہیں ہم نہایت حقیر و ذلیل وجود سمجھتے ہیں ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے، مگر ہم انسان اشرف المخلوقات ہونے کے

باوجود، دنیا میں ہر انسان کے بھائی ہونے کے باوجود معمولی سے مذہبی اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

آہ! موجودہ دنیا کے "مذہب پرستوں" نے صحیح مذہب کی رُوح کو اپنے ذاتی اغراض اور دل و دماغ کی گمراہیوں کے بوجھ کے نیچے دفن کر دیا ہے، اور اب وحشت و بربریت کی اندھیری رات میں کتّوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ رہے ہیں۔

مذہب کا بنیادی اصول ہے انسانیت پرستی؛ اور اہلِ مذہب کا سب سے پہلا اصول ہے انسانیت کو ذبح کرنا۔ مذہب کا پہلا سبق ہے دُنیا کے ہر انسان کو اپنا بھائی سمجھو اور موجودہ علمبردارانِ مذہب اپنے حقیقی بھائیوں کو بھی غیر سمجھ رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قانون کے ایک ہاتھ میں انصاف کا ترازو ہے اور دوسرے ہاتھ میں سزا کی تلوار۔ وُہ ہر شخص کے جرم کو اس ترازو میں تولتا ہے اس کے بعد اس کی سزا کی تلوار اپنا کام کرتی ہے۔ مجرم دولتمند ہو یا غریب، سوسائٹی کا اعلیٰ فرد ہو یا معمولی رُکن، قانون اپنے فرائض کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھول سکتا لیکن میری بدنصیب نگاہیں دیکھتی ہیں کہ آج قانون کا انصاف والا ہاتھ تو بالکل مفلوج ہو چکا ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ کی ہر حرکت دَولت کے اشارے

کی مرہونِ منت ہے۔ اول تو قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے کیلئے دولت سے بھری ہوئی جیبوں کی ضرورت ہے اور اگر قانون کا دروازہ کھُل بھی جائے جب بھی انصاف کی توقع نہیں۔ آج قانون انصاف اور بے انصافی کا فیصلہ نہیں کرتا دولت اور ناداری کی فتح و شکست کا فیصلہ کرتا ہے، شرافت اور شرارت کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ کرتا ہے، مکاری اور راستبازی کی کامرانی و ناکامیابی کا فیصلہ کرتا ہے۔ آج انصاف قانون کی موٹی موٹی کتابوں میں ہے حاکم کے قلم میں نہیں وائے بر حالِ ما۔

رہ گئی حکومت، سو اس کے متعلق کیا کہا جائے۔

دُنیا میں یہ ظالمانہ قتل و غارت، یہ ہولناک تباہی و بربادی، یہ دہشتناک کُشت و خون کس کے اشارے پر ہو رہا ہے؟

مجھے آجتک کسی گاؤں کی معاشرت دیکھنے اور اس کا جائزہ لینے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ چنانچہ جب میں گاؤں کی سادہ اور معصوم فضا میں صبح و شام تیرتے ہوئے رُومان انگیز نظاروں کا ذکر پڑھتا یا سنتا تو میرے دل میں ایک دیرینہ تمنا چٹکیاں لینے لگتی۔

میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب کے دسہرے کی تعطیلات میں ضرور بالضرور کسی گاؤں میں جاؤں گا اور کم از کم دو دن وہاں رہوں گا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے ایک نہایت عزیز کو ہفتے میں دو بار گاؤں جانا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب باتوں باتوں میں میں نے ان سے اپنی آرزو کا ذکر کیا تو وہ فرمانے لگے "دسہرے کی تعطیلات کا انتظار کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹیاں لے لو، اور گاؤں چلے جاؤ۔ رؤف تمہارے ساتھ چلا جائیگا۔ وہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو گی۔ مگر میں تمہیں اتنا کہے دیتا ہوں کہ گاؤں میں تمہارا دل نہیں لگے گا۔ وہاں سینما اور شہر کی چہل پہل کہاں"؟

میں نے دوسرے دن دفتر سے چھٹیاں لے لیں اور مسٹر رؤف کے ساتھ گاؤں کو روانہ ہو گیا۔

یہ گاؤں پنجاب کا ایک نہایت معمولی اور غیر معروف گاؤں ہے اور اس کا نام ہے "رلنی"!

دوسرے دن میں تمام گاؤں میں پھرا۔ سورج کے طلوع ہونے سے لے کر شام کی تاریکی تک میری نگاہوں نے جو کچھ دیکھا وہ میں کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ میں جن شاعرانہ رنگینیوں کی تلاش میں وہاں گیا تھا، ان کا پرتو بھی کسی

گوشے میں نظر نہ آیا۔ دیکھا تو ہر طرف دماغ پاش گندگی کو دیکھا —— دیکھا تو ہر طرف عسرت کے پنجے میں جکڑے ہوئے نحیف و نزار جسموں کو دیکھا۔ تمام گاؤں کیا ہے؟ نحیف و نزار، بیجان اَور زندگی کی حرارت سے محروم انسانی جسموں، کچے لوٹے پھوٹے اَور گندے مکانوں' اَور مریل کمزور، ناتواں مویشیوں کا مسکن۔ حیرت ہوتی ہے یہاں لوگ کیونکر زندگی بسر کیا کرتے ہیں؟ کیا ان کے دماغ اس قدر تعفن آلود ہو چکے ہیں کہ اب زندگی کا احساس بھی نہیں کر سکتے —— کیا انہیں زندگی کی بلندی اَور روشنی سے اسدرجہ محروم کر دیا گیا ہے کہ اب ان کے ذہن میں زندگی کے بلند مقاصد کا تصور بھی نہیں آسکتا، اور ان کے سینوں کو عزّتِ نفس سے اس طرح خالی کر دیا گیا ہے کہ اب وُہ ہر زمیندار کے سامنے سر جھکانے کے سوا اَور کچھ جانتے ہی نہیں؟؟

مانا کہ اِن لوگوں کو شب و روز محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے اور یہ بھی مانا کہ زمیندار اَور مہاجن اِن پر ظلم کر کے ان سے سب کچھ چھین لیتے ہیں مگر ان کی روحوں کا وُہ مقدس شعلہ جسے دنیا خودداری کہتی ہے کہاں گیا؟ کیوں بجھ گیا؟؟ کیا یہ سر جھکانا اَور ہر وقت سر جھکانا ہی مقصدِ حیات سمجھتے ہیں؟

مسٹر رؤف مجھ پر رعب جمانے کے لئے بار بار مزارعوں کو حکم دیتے تھے

اور مزارع تھے کہ انسانیت کُش عاجزی کے ساتھ ان کے ہر حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ میں سوچتا تھا، مسٹر رؤف کو یہ روّیہ اختیار کرنے کا کیا حق ہے۔ وہ ایک زمیندار کے بیٹے ہیں، بس اسی حق پر وہ مزارعوں سے نوکروں کا کام لے رہے ہیں، گویا نسلِ انسانی کے ان تمام افراد کو جو گاؤں میں سانس لے رہے ہیں، مذہباً اور قانوناً غلامانہ زندگی بسر کرنی چاہیئے۔

مسٹر رؤف نے مجھے بتایا کہ انہوں نے گزشتہ سال ایک مزارع کو اپنے کام سے اس لئے برطرف کر دیا تھا کہ اس نے ایک سوال کے جواب میں گستاخانہ طرزِ تکلم اختیار کیا تھا۔ اس کے بعد مغضوب مزارع نے سر سے پگڑی اتار کر ان کے پاؤں پر رکھی مگر گستاخی کوئی معمولی جرم نہیں تھا کہ معاف کر دیا جاتا۔

میرے رفیقِ سفر بڑے فخر کے ساتھ یہ واقعہ بیان کر رہے تھے اور میں انسانیت کی اس ذلت پر زمین میں گڑا جاتا تھا۔

بات دراصل یہ ہے زمینداروں نے ان لوگوں کے دل و دماغ میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ تم کچھ بھی نہیں ہو اور نہ کبھی کچھ ہو سکتے ہو! تمہیں زندہ رہنا ہے تو ہمارے رحم و کرم پر زندہ رہنا ہے۔ زمین ہماری ہے اور

زمین ہی تمہاری زندگی کا واحد ذریعہ ہے۔

میں نے بہتیری کوشش کی کہ گاؤں میں کوئی ایسا شخص مل جائے جسکے خیالات بلند ہوں اور جو اپنی ذات کو اس قدر حقیر نہ سمجھتا ہو مگر سخت افسوس ہے میری کوشش کہیں بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ گاؤں والوں کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟ تو میں فی الفور کہدونگا " احساس کمتری " (Inferiority complex) احساس کمتری نسلاً بعد نسلاً ان کے دماغوں پر چھایا ہوا ہے۔

ان کے دادا بھی اس ذلیل زندگی پر مطمئن تھے، یہ بھی مطمئن ہیں۔ اور ان کے غلامانہ فضا میں پرورش پانے والے بچے بھی یقیناً اسی زندگی پر مطمئن ہونگے!

رات سینما سے آتے وقت اتفاقاً میں شبیر کے دولتکدے پر چلا گیا۔ مسٹر شبیر ایک دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے اپنا زیادہ وقت فنون لطیفہ کے مطالعے میں بسر کرتے ہیں۔ احباب ان کی ہر رائے کو بڑی قدر و منزلت سے دیکھتے ہیں اور وہ بھی اپنا علم صرف اپنے تک محدود نہیں رکھتے۔ چنانچہ جسوقت میں ان کے آراستہ و پیراستہ ڈرائینگ روم میں

پہنچا، وُہ چار پانچ دوستوں کے درمیان بیٹھے جن بھوتوں کے متعلق حیرت انگیز واقعات سنا رہے تھے۔ ان کی رایوں کی تائید میں دوست بھی سچے جھوٹے "افسانے" سنا رہے تھے۔

جب یہ مجمع برخاست ہونے لگا تو ہر دوست اس گفتگو پر پریشانی کا اظہار کر رہا تھا اور اس اظہار پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ وُہ سمجھتے تھے کہ اب تمام رات ڈراؤنے خواب آتے رہیں گے۔ ایک دوست نے تو کمال کر دیا، کہنے لگے،

"میں اکیلا گھر نہیں جاؤں گا۔ ایک مرتبہ جن بھُوت کی کہانی سُن کر مَیں تنہا رات کے وقت گھر کو جا رہا تھا۔ کہ مجھے محسوس ہُوا جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ مجھے معلوم نہیں۔ اس وقت میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ صبح کے وقت میں بخار میں مبتلا تھا۔"

میں یہ واقعہ سن کر بہت حیران ہوا۔ بچے تو جن بھوتوں سے ڈرتے رہتے ہیں مگر یہ نوجوان جو ملک و قوم کی امیدوں کا مرکز ہیں کیوں اسقدر کمزور دل و دماغ کے مالک ہیں۔ یہ نوجوان جو رات کے وقت تنہا کسی تاریک راستے سے گزرنے میں خوف محسوس کرتے ہیں۔ کیونکر زندگی کے حوادث کا مقابلہ کر سکیں گے؟

زندگی تو شیر کا دل چاہتی ہے۔ شیر دل انسان ہی زندگی کے میدان میں فتح حاصل کر سکتا ہے۔ مگر ہم — ہم کیا ہیں؟ ذرا سے حادثے پر دہشت زدہ ہو جاتے ہیں معمولی معمولی مصیبت پر خوف سے کانپنے لگتے ہیں، حقیر حقیر بات پر لرز لرز جاتے ہیں۔

خوف ممکن ہے لوگوں کے نقطۂ نظر سے ایک معمولی سی کمزوری ہو، مگر میرے خیال میں خوف انسانیت کے لئے سب سے بڑی ہلاکت ہے۔

ایک کمزور دل انسان جو رات کی تاریکی میں گھر سے نکلتے گھبراتا ہو زندگی کی فتوحاتِ عظیمہ میں حصہ لینا تو درکنار، ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

چند دن ہوئے میں ترکی کے ایک شیر دل ہیرو کی داستانِ حیات پڑھ رہا تھا۔ مصنف نے لکھا ہے کہ جب وہ بچہ تھا تو ماں سے یہ سن کر کہ اس کا باپ میدانِ جنگ میں لڑ رہا ہے رات کے اندھیرے میں گھر سے نکل پڑا کہ جا کر اپنے باپ کی مدد کرے۔

یہ ہے ایک آزاد قوم کے بچے کی حالت! یہ بچہ قوم کا کوئی مخصوص بچہ نہیں بلکہ قوم کی اجتماعی ذہنیت کا نمائندہ ہے۔

حقیقتاً ایک آزاد قوم کی ذہنیت خوف و دہشت کے سائے سے بھی

ناآشنا ہوتی ہے۔ اور غلام قوم کی ذہنیت خوف و دہشت میں ڈوبی ہوئی۔

ہمارے یہاں ماؤں کا عجب دستور ہے۔ وُہ اپنے بچوں کو خاموش کرنے کے لئے کہہ دیتی ہیں "وُہ دیکھو ڈائن آئی"۔ اور بچے ڈر کر، سمٹ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ بظاہر یہ معمولی سی بات ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ماؤں کی یہ معمولی سی حرکت موجودہ نسل کی ذہنی نشو و نما کو نقصان نہیں پہنچا رہی!

آزاد قوم کے بچوں کو کھیلنے کے لئے چھوٹے چھوٹے نیزے اور تلواریں دی جاتی ہیں۔ تاکہ غیر شعوری طور پر انہیں آغازِ طفولیت ہی میں معلوم ہو جائے کہ انہیں زندگی کے میدان میں نیزوں اور تلواروں سے کام لینا ہے مگر غلام قوم کے بچوں کو طرح طرح کی "ڈائنوں" اور "ہوّوؤں" سے ڈرایا جاتا ہے تاکہ وہ زندگی کی ہر منزل پر قدم رکھتے ہوئے ڈریں۔

پرل۔ ایس۔ بک کی معرکتہ الآرا کتاب "دھرتی ماتا" کے ہیرو وانگ لنگ کے خاندان کے دلچسپ حالات خود دھرتی ماتا کے مصنف کے گوہر بار قلم سے اس کی دوسری کتاب "بیٹے" میں ملاحظہ کرنے کے قابل ہیں۔

چینی زندگی کی اس دلچسپ اور وجد آفرین کہانی میں وانگ لنگ کے دو بیٹوں کی اس کشمکش کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنی زمین سے علیحدہ ہو جانے کے لئے کی۔ وُہ اپنی زمین بیچ دیتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک بیٹا چین میں جرنیل بن جاتا ہے۔ لیکن زمین جو اب وانگ لنگ کے زمانہ سے کہیں زیادہ مہربان ہو چکی ہے۔ اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وانگ لنگ کی رُوح اپنی اس زمین پر اب بھی منڈلاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جس کو وُہ اپنی زندگی میں دل وجان سے چاہتا تھا۔ اور یہی رُوح ہے جو اس کے بیٹوں کو زمین سے علیحدہ نہیں ہونے دیتی۔

انتہائی دلچسپ اور قابل قدر کتاب ہے جس کا ترجمہ سید احسان علی شاہ بی اے (آنرز) کے قلم کا رہین ہے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

دُنیا کی رنگین مزاج عورتیں

یہ کتاب دُنیا کی اُن مشہور و معروف عورتوں کی عشقیہ داستانوں پر مشتمل ہے۔ جن کے نام شہرت کے آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھ کر آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ عورت خواہ ملکہ ہی کیوں نہ ہو۔ محبت سے مجبور ہو کر ایک حبشی تک کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہے۔ دنیا کی مشہور مشہور شہزادیوں اور ملکاؤں کے والہانہ عشق کی تصویر اگر آپ کو دیکھنی ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔

ہر داستان کی زبان اس قدر خوبصورت اور رنگین ہے کہ نثر پر نظم ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایسی خوبصورت اور رنگین زبان اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔ کتاب کے مصنف ملک کے مشہور ادیب راجہ مہدی علی خاں صاحب ہیں۔

کاغذ نفیس، لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ مجلد کتاب کی قیمت عہ

ملنے کا پتہ

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

شمع دان

مغربی ادب کے بہترین افسانوں کا مجموعہ

اس کتاب میں دنیا کے ہر ملک کے بہترین افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ منتخب کر کے درج کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ہر ملک کے بہترین افسانہ نگار کا بہترین افسانہ پیش کیا جائے۔ افسانے کیا ہیں؟ عشق و محبت کی رنگین داستانوں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہیں۔ افسانوں کا اس سے بہتر انتخاب اس سے پہلے شائع نہیں ہوا۔

اگر آپ اپنی راتوں کو محبت کے نور سے روشن کرنا چاہتے ہیں تو "شمعدان" پڑھیئے۔ اس کا ایک ایک افسانہ آپ کو عشق و محبت کی مہکی ہوئی وادیوں کی سیر کرائیگا

ان افسانوں کا ترجمہ شاعر رُومان راجہ مہدی علیخان صاحب نے کیا ہے

کاغذ نفیس۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ مجلد کتاب کی قیمت عہ

ملنے کا پتہ

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجرانِ کتب لوہاری دروازہ لاہور

کملا

بنگالی زبان کے ایک مشہور ناول "بارواری" کا اردو ترجمہ

آہوں، آنسوؤں، اور مسکراہٹوں کا طوفان۔ عشق کی جنون فرمائیاں اور حسن کی کافرادائیاں اگر دیکھنی مطلوب ہوں تو اس ناول کو ملاحظہ فرمایئے

نفیس کاغذ۔ شاندار گیٹ اپ

بنگالی زبان کا یہ مشہور ناول بنگال کے بارہ مشہور مصنفین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے ہر مصنف نے اس کے مختلف باب لکھے ہیں۔ یہ کتاب عشق و محبت کی ایک رنگین داستان ہے۔ اگر ایک مرتبہ آپ اسے شروع کریں گے تو جب تک ختم نہ کر لیں گے آپکو چین نہیں آئیگا۔ یہ وہ ناول ہے جس پر بنگالی ادب کو ناز ہے۔ اس کا ترجمہ ملک کے مشہور ادیب اور شاعر راجہ مہدی علیخان صاحب نے کیا ہے قیمت عہر

پبلشرز

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجرانِ کتب اندرونِ لوہاری دروازہ لاہور

برف کا دیوتا اور دیگر افسانے

ملک کے مایۂ ناز ادیب حضرت سیاح سنامی کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جن کو پڑھ کر آپ ششدر رہ جائیں گے۔ فطرت کا مطالعہ، زبان کی بندش اور خیالات کی گہرائی ان افسانوں کی خوبیاں ہیں۔ ہر افسانہ زندگی کی کسی پوشیدہ گتھی کو سلجھاتا ہے۔ جس کے خاتمہ پر پڑھنے والا کوئی نیا سبق حاصل کرتا ہے۔ اتنے سبق آموز افسانے آپ نے پہلے نہ پڑھے ہونگے

قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

معیارِ محبت اور دیگر افسانے

پنجاب کے مایۂ ناز ادیب حضرت سیاح سنامی کے چیدہ و برگزیدہ افسانوں کا مجموعہ جن میں سے ہر ایک کہانی تخیل کی رنگینی اور بلند پروازی کا نمونہ ہے حسن و نشاط کے یہ افسانے ایک بار پڑھ کر آپ کو مدت العمر نہ بھولیں گے مطلب کی گہرائی، درد اور تاثیر ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ اعلیٰ کاغذ، حجم تقریباً ... صفحات۔ قیمت مجلد ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ:۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجرانِ کتب لوہاری دروازہ لاہور